کینیڈا کہانیاں

سیّد اعجاز گیلانی

طٰہٰ پبلی کیشنز

19 - ملک جلال الدین (وقف) بلڈنگ چوک اُردو بازار لاہور
Ph: 0333-4470509 WhatsApp: 0312-4033137

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ طٰہٰ پبلی کیشنز سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا' اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتِ حال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔ (قانونی مشیر: فیاض احمد مہر۔ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

طٰہٰ

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب : کینیڈا کہانیاں
ناشر : محمد عفیف طٰہٰ
اشاعت اوّل : اپریل 2025ء
سرِ ورق : مجاہد چوہان
قیمت : 800 روپے
بیرونِ ملک : 20 ڈالر
مطبع : ثناء اللہ پرنٹرز' لاہور
زیر اہتمام: عوامی ثقافتی انجمن' چونیاں' ضلع قصور: قیصر سلمان غوری

انتساب

آپ کے ماں اور باپ سے بڑھ کر کوئی پیر و مرشد،
ولیٔ کامل اور بزرگ نہیں ہو سکتا۔ والدین سے
محبت سے بات کرنا، ان کے چہرے کو دیکھنا
اور خدمت سے دُعائیں لینا عبادت ہے۔
رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا ﴿٢٤﴾

عزت و محبت سے دُعاؤں میں شامل رکھنے والے
عزاء و اقرباء اور دوستوں کے علاوہ تمام پردیسیوں
کے نام

پیش لفظ

کہا جاتا ہے کہ آپ کے قیمتی الفاظ کی حیثیت ردی کی سی ہوتی ہے اگر آپ کا مخاطب یا قاری کباڑیا ہو۔

ایک سامع یا قاری کی ذہنی وفکری سطح، مطالعہ کا شوق اور تجسس بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ کہانیاں سنانے، سننے، لکھنے اور پڑھنے کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ حضرت انسان، اکثر کہانیاں دل ودماغ پر بوجھ ہوتی ہیں جنہیں بیان کر کے انسان ہلکا محسوس کرتا ہے، اگر کوئی سننے والا پاس نہ ہوتو ایسی مسلسل کیفیت اذیت سے بڑھ کر ذہنی دباؤ یعنی ڈپریشن بن جاتی ہے۔

ایک بچے کے پاس حقیقی کہانی کبھی نہیں ہوتی کیونکہ اس کو تو بڑوں کی طرف سے کہانیاں سننے کو ملتی ہیں جس کی دنیا بھر میں روایت موجود ہے۔ کہانی ہمیشہ عمر کے ساتھ جنم لیتی ہے جو بڑھتی، پھلتی و پھولتی، کئی راستوں پر چلتی اور موڑ اختیار کرتی ہوئی انجام کو پہنچتی ہے۔

اچھی کہانی بنانے اور بیان کرنے کے لیے ایک عمر چاہیے ہوتی ہے۔ قصص القرآن کی ایک کتاب مجھے بطور پروف ریڈر 35 سال قبل پڑھنے کا موقعہ ملا تھا۔ نوائے وقت کے فیملی میگزین میں سچی کہانیوں کے صفحات بھی کچھ عرصہ کے لیے ایڈیٹ کرنے کی ذمہ دار ملی تھی۔ اس کے باوجود کہانیاں لکھنے کے معاملے میں خود کو پیشہ ور ادیب قطعاً نہیں سمجھتا۔ آپ کے بھی علم میں ہوگا کہ کہانیاں لکھنے پر دنیا میں بے شمار خواتین وحضرات کو ملکہ حاصل رہا ہے۔ جرائد، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کے لیے موضوع کی ضرورت کے تحت

بھاری معاوضوں پر بیشتر زبانوں میں کہانیاں لکھنے والے ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ یقین مانیں میری لکھی ہوئی ان کہانیوں کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ یہ عام لوگوں کی خاص کہانیاں ہیں۔

کہانی' سنانے اور لکھنے والے کو اپنے بچے کی طرح عزیز ہوتی ہے۔ میری والدہ محترمہ عمر پیری میں ہیں۔ والد صاحب کی فالج کے مرض سے قوت گویائی چھن گئی ہے۔ میں نے ان کے ساتھ بڑھاپے اور بیماری میں محدود دستیاب وقت گزارنے کے بعد اخذ کیا ہے کہ بزرگ چاہتے ہیں کہ کوئی ان کے پاس بیٹھے اور ان کی بات سُنے کیونکہ ان کے پاس کہنے اور بتانے کے لیے وہ وقت ہوتا ہے' اس سے پہلے ان کو زندگی میں نہیں ملا تھا۔ وہ زندگی میں اپنی جدوجہد' کامیابیاں' ناکامیاں' پچھتاوے اور زندگی کے اسباق آپ سے شیئر کرنا چاہتے ہیں۔

یقین کریں جب ہم اپنی مصروفیت کی وجہ سے ان کی روداد اور واقعات جو وہ بار بار نیا سمجھ کر بیان کرتے ہیں ہم نہیں سنتے یا بوریت محسوس کرتے ہیں تو ہماری عدم دلچسپی سے وہ بچوں کی طرح دکھی اور ناراض ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں:

''ہماری تو کوئی سنتا ہی نہیں''۔

اگر آپ کے والدین حیات ہیں تو انہیں وقت دیں' پاس بیٹھ کر ان کی بات غور سے سنیں۔ اس دوران چھوٹا سا سوال کر کے فیڈ بیک دیں اور ان کی خوشی کو محسوس کرنے کی کوشش کریں۔

کہانیاں سچی ہوتی ہیں یا بنائی جاتی ہیں لیکن سبھی ہماری زندگی سے جڑی ہوتی ہیں۔ کہانیاں المیہ ہوتی ہیں یا پھر طربیہ' لیکن اچھی کہانیوں کی خوبی ہوتی ہے کہ ان سے دعوتِ فکر کے ساتھ اخلاقی سبق بھی ملتے ہیں۔

کہانیاں کبھی سیدھی نہیں ہوتیں ان میں کئی طرح کے بھیانک اور خوبصورت موڑ ہوتے ہیں جنہیں انگریزی میں twist کہا جاتا ہے۔

ہر ایک شخص کی اپنی کہانی ہوتی ہے۔ جسے وہ ہر ایک کو نہیں سنانا چاہتا۔ عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ لوگ آپ سے دلجوئی کی خواہش کے ساتھ اپنی ناکامیاں شیئر کرتے ہیں اور کامیابیاں چھپا کر رکھتے ہیں کہ کہیں آپ بھی اس راستے پر عمل سے مستفید نہ ہو جائیں۔

مقبول عام کہانیوں میں آپ کو غم، رنج والم، جفا، بے اعتنائی، دکھ اور پچھتاوے زیادہ ملیں گے کیونکہ فطری طور انسان غم اور گداز میں زیادہ راحت محسوس کرتا ہے۔ بیان کی گئی یا لکھی ہوئی بہت سی کہانیاں آپ کے سر سے گزر جاتی ہیں اور بعض ہمارے دل و دماغ پر ان مٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔

کتاب میں شامل بیس کہانیاں کینیڈا میں گزارے ہوئے بیس سال کے دوران کشید کی گئی ہیں۔ ان کہانیوں میں محض تلخ و شیریں واقعات کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ کینیڈا کی عام زندگی، مروجہ قوانین اور مختلف مواقع پر روا رکھے جانے والے انسانی رویوں کے بارے بھی آگاہی دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

کینیڈا کہانیاں ایک سلسلے کا آغاز ہے اور انشاللہ آنے والے دنوں میں مزید دلچسپ کہانیوں کو لکھنے اور کتابی شکل دینے پر کام جاری رکھا جائے گا۔ کتاب میں شامل تمام کہانیاں اور اس کے کردار حقیقی ہیں لیکن ان کے مقامات اور نام تبدیل کر دیئے گئے ہیں، پھر بھی کسی مقام یا کردار کی کوئی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔

اگر آپ کو ان کہانیوں میں سے کوئی کہانی زیادہ پسند آئی ہو تو فیڈ بیک ضرور دیں، اگر کوئی واقعہ یا نقطہء نظر ناگواری کا باعث بنا ہو تو پیشگی معذرت خواہ ہیں۔

آپ کی علم، ادب اور کتاب دوستی زندہ باد

سیّد اعجاز گیلانی
لاہور۔ پاکستان/کینیڈا
urducanadaofficial@gmail.com

اپریل 2025ء

تارکینِ وطن کے دُکھ اور محرومیوں کا نوحہ

مستقبل کے سہانے خواب قلب ونظر میں سجانے والے جہاں گردوں کی زیادہ تر منزل یورپ' امریکہ یا کینیڈا سے کم نہیں ہوتی کیونکہ انہوں نے وہاں کی ترقی اور سہولیات سے آراستہ زندگی کے ساتھ ساتھ وہاں رہنے بسنے والے لوگوں کی زندہ دلی کے سوشل میڈیا پر شیئر ہونے والے بصری قصوں اور واقعات پر صمیمِ قلب سے اعتماد کرلیا ہوتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''کینیڈا کہانیاں''۔ برادر مکرم سیّد اعجاز گیلانی نے کینیڈا میں 20 سال قیام کے دوران مختلف تارکینِ وطن کو ملنے اور سننے کے بعد سچے واقعات کو کہانیوں کا روپ دے کر انتہائی فکر انگیز انداز میں حقیقت کو آشکار کرنے کی عملی کوشش کی ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اپنے دیس' اپنے شہر اور اپنے گھر میں معمول کی زندگی بسر کرتے کرتے سہانے خواب کی تعبیر کے لیے سمندر پار کے سفر میں اپنا سکھ' چین تج کر کے اور جمع پونجی لٹا کر اگر ان کو کینیڈا کا ویزا' مستقل قیام اور شہریت مل بھی جائے' تو اپنی شناخت' اپنا دین' اپنے رشتے اور عزیزوں کی محبت' ان کی چاہت اور راحت کو قسمت سے ہی انجوائے کر پاتے ہیں۔

''کینیڈا کہانیاں'' میں مصنف نے متعدد خاندانوں کی کہانیوں کو قلب ونظر کی گہرائی میں ڈوب کر یوں صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے کہ پڑھنے والا اس کے اثرات کو

محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس کتاب کے حرف حرف' سطر سطر اور ورق ورق کو میں نے پڑھا ہے۔ اس دوران میں جس کیفیت سے گزرا خود ہی جانتا ہوں' بعض کہانیوں کے جذباتی اور المناک باب پڑھ کر آنکھوں میں سے آنسو ٹپکے اور کبھی روشن مستقبل کے متلاشیان کی وفاؤں کے بدلے میں جفاؤں پر افسوس ہوا۔ ایسے بھی تھے جو اپنے ہی بیوی بچوں کی بیگانگی کا شکار ہو کر لاوارث دفن ہوئے اور بعض نے اپنے پیاروں کو مرنے کے بعد پہچاننے سے انکار کر دیا۔

بعض کہانیوں میں مصنف نے اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدات سے کینیڈا میں عام زندگی میں رہن سہن کے ساتھ کام اور ملازمت کی جگہوں پر اصول' ضوابط اور مجموعی رویوں کو بڑے احسن انداز میں بیان کیا ہے جن پر عمل کر کے کینیڈا میں نو وارد تارکینِ وطن اپنی روزمرہ کی زندگی میں مشکلات سے بچ کر بہتری اور آسانیاں لا سکتے ہیں۔

سید اعجاز گیلانی کی یہ تصنیف محض روایتی کتاب نہیں بلکہ اس میں شامل ہر ایک کہانی کینیڈا کی زندگی کے تلخ حقائق اور پس پردہ سچائی کو آشکار کرتی ہے۔

انہوں نے تمام کہانیوں میں سلیس زبان و بیان اور انداز تحریر سے حقیقت پسندی کو قائم رکھا ہے تا کہ قارئین بیرونی ممالک میں بسنے والوں کے لائف سٹائل سے متاثر ہونے کی بجائے ان کی شب و روز محنت اور درپیش مشکلات کا حقیقی معنوں میں ادراک کر سکیں۔ میرے بیشتر عقیدت مند اور دوست احباب روزگار کے سلسلے میں متعدد ممالک میں مقیم ہیں۔ جب کبھی ان کی پاکستان آمد پر ملاقات ہوئی تو وہ دیارِ غیر میں سب سے زیادہ وطن عزیز پاکستان کے گلی محلوں' کھیت کھلیانوں' میدانوں' شہروں اور گاؤں میں بسنے والے رشتہ داروں اور عزیزوں کو یاد کرتے ہیں۔ وہ انہیں خوش قسمت سمجھتے ہیں کیونکہ یہ سال ہا سال اپنوں کو مل نہیں پاتے' لیکن بھلا ہو ٹیکنالوجی کا جس کی وجہ سے فون کال سے بڑھ کر ویڈیو کال نے بظاہر دوریاں ختم کر رکھی ہیں۔

سیّد اعجاز گیلانی ایک لحاظ سے بڑے خوش نصیب ہیں جو اپنے والدین' عزیز

واقارب اور دوستوں سے نہ صرف ملاقات بلکہ ان کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے عملی طور پر پاکستان باقاعدگی سے آتے جاتے رہتے ہیں۔

بعض بے تکلف اور محبت کرنے والے احباب تو یہ کہتے سنے گئے ہیں:

''گیلانی صاحب! آپ نے تو کینیڈا اور لاہور کا فرق مٹا دیا ہے۔ جب دیکھو آپ سے ملاقات ہو جاتی ہے''۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں:

''پتہ ہی نہیں چلتا آپ کب کینیڈا میں اور کس وقت لاہور میں ہوتے ہیں؟''

میری دعا ہے کہ اللہ کریم انہیں اپنی فیملی کے ساتھ شاد و آباد رکھے اور کینیڈا میں پاکستان کے روشن چہرے کو اجاگر کرنے والے سفیر بن کر رہیں۔

زیرِ نظر تصنیف ''کینیڈا کہانیاں'' سے قبل سیّد اعجاز گیلانی کی 6 کتب ''سرزمین خاک وخون' دنیا کی امید پاکستان' دور کے ڈھول سہانے' باتوں کے رنگ' حج بیتی' منتخب مضامین اور اداریے شائع ہو چکی ہیں یہ ساتویں کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے کہ ایسی کہانیوں پر مشتمل مزید ایڈیشن بھی اہل ادب کے لیے ایک تحفہ ثابت ہوں گے۔ سیّد اعجاز گیلانی کی کینیڈا میں سماجی اور دینی و تعلیمی خدمات کے ساتھ پاکستان دوستی وحب الوطنی اپنی مثال آپ ہے۔

اللہ کریم ہمارے بھائی کو تمام محاذوں پر خدمت کی کامل توفیق' وسائل' آسانیاں و کامیابیاں عطاء فرمائے آمین بحرمت سیّد المرسلین ﷺ

سیّد ارشد حسین گیلانی
سابق مرکزی صدر انجمن اساتذہ پاکستان
ڈائریکٹر مصطفائی سکول سسٹم چھانگا مانگا
0300-1284900

اپریل 2025ء

ادب اور ہجرت کے امتزاج کی ایک خوبصورت مثال

''کینیڈا کہانیاں'' اعجاز گیلانی کا ایسا تخلیقی مجموعہ ہے جو صرف ہجرت اور پردیس کی کہانیوں کا بیان نہیں بلکہ احساسات، ثقافتوں کے ٹکراؤ، اور نئی زندگی کے چیلنجز کی عکاسی بھی ہے۔ گیلانی صاحب کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی اس کا سچائی سے قریب تر ہونا ہے۔ انہوں نے نہ صرف پردیس میں بسنے والے پاکستانیوں کے مسائل بیان کیے، بلکہ اُن جذبات کو بھی زبان دی ہے جو ہر تارکِ وطن کے دل میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

زبان سادہ، بیانیہ رواں، اور مشاہدہ نہایت گہرا ہے۔ کینیڈا میں رہنے والوں کی روزمرہ زندگی، اُن کے تجربات، خواب اور ٹوٹتے رشتے کہانیوں میں اس خوبی سے سموئے گئے ہیں کہ قاری خود کو کرداروں کے قریب محسوس کرتا ہے۔

یہ مجموعہ ان لوگوں کے لیے خاص دلچسپی رکھتا ہے جو ہجرت کے بعد کے تجربات کو سمجھنا چاہتے ہیں، یا خود اس راستے سے گزر رہے ہیں۔ ''کینیڈا کہانیاں'' ادب اور ہجرت کے امتزاج کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

محمود ربانی انجم
پرنسپل
پنجاب ورکرز ویلفیئر فنڈ، سیالکوٹ
اپریل 2025ء

..1

پاکستان سے کینیڈا کے لیے روانہ ہونے سے کچھ دن قبل مَیں تمام دوستوں سے ملنے کی کوشش کر رہا تھا۔صدیق حجام جس سے میں سال ہا سال سے اپنی کٹنگ کی خدمات لے رہا تھا اسے ملا اور میں نے بتایا:

''لے بھائی صدیق! میں اگلے ہفتے کینیڈا جا رہا ہوں وہاں مجھے فیملی سمیت شہریت مل گئی ہے''۔

یہ سن کر صدیق کا چہرہ کھل اٹھا اور اس نے معانقہ کیا اور کہنے لگا:

'' آپ کو بہت مبارک ہو۔آپ ایک بڑے ملک کینیڈا میں جا رہے ہیں۔مَیں نے اخبارات میں پڑھا ہے کہ کینیڈا بہت پُرامن اور اچھا ملک ہے۔پوری دنیا سے پڑھے لکھے اور ہنرمند لوگوں کو وہ اپنے ملک میں مستقل رہنے اور کام کرنے کی کھلی دعوت دیتے ہیں''۔

ایک ہی سانس میں صدیق نے کینیڈا کے بارے میں اپنی معلومات کھول کر رکھ دیں۔ قدرے دھیمے لہجے میں جبکہ وہ فرش کی طرف دیکھ رہا تھا صدیق پھر گویا ہوا:

''سر ہم تو میٹرک فیل ہیں ہمارے جیسے کینیڈا شاید ساری عمر نہ جا سکیں مگر آپ کو تعلیم اور ہنر نے اس قابل بنا دیا کہ آپ کے بچے بھی کینیڈا ایسے ملک کے بہترین سکولز میں تعلیم حاصل کریں گے''۔

میں نے اس کا شکریہ ادا اور کہا:

''تم نے بہت عزت دی ہے اور خدمت بھی کی ہے،بہت اچھا وقت گزرا

ہے آپ کے ساتھ۔ دعاؤں میں یاد رکھنا ہم بھی آپ کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے''۔

اچانک اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا:

''اس طرح نہیں، آپ میرے ساتھ چائے پی کر جائیں گے''۔

میں جلدی میں ہونے کے باوجود اس کا انداز دیکھ کر انکار نہ کر سکا اس نے اپنے شاگرد کو کہا:

''جا اوے سامنے سے اچھی سی چائے بنوا کر جلدی آ میرا پتر''۔

مجھے چائے کے لیے کچھ دیر اپنے پاس روک کر صدیق خوش تھا اور کہنے لگا:

''آپ کو میں نے چائے کے بہانے اس لیے روکا ہے کہ میں آپ کو گزشتہ رات پیش آنے والا واقعہ سنانا بھی چاہتا ہوں''۔

میں نے جواباً کہا:

''ایسا کیا واقعہ ہو گیا جو مجھے سنانا ضروری سمجھ رہے ہو؟''

صدیق نے کہا:

''آپ سنیں تو سہی''۔

''کل دوپہر ساتھ والے گاؤں میں دیگوں کی پکوائی کا آرڈر ملا تھا۔ ایک جاننے والے کے گھر چالیسویں کا ختم تھا۔ میرا نوجوان بھانجا کام پر میرے ساتھ تھا۔ سردی میں دن بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس لیے پکوائی کے بعد کام سمیٹنے میں شام اور پھر اندھیرا ہو گیا۔ ہمارے پاس موٹر سائیکل تھی۔ میں نے گھر والوں کو کہا بھی:''

''ہمیں فارغ کریں تا کہ ہم ٹائم سے اپنے گھر جائیں''۔

مگر وہ اپنے مہمانوں کو رخصت کرنے میں لگے رہے۔

میرا بھانجا موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ تاریکی میں ڈوبی سڑک سنسان تھی اور دائیں بائیں آپ کو پتہ ہے ہمارے گاؤں تک فصلیں ہیں۔ صدیق نے مجھ سے فیڈ بیک کے

لیے یہ کہا۔

''مجھے علم ہے کماد کی فصل ہوتی ہے اس روڈ پر''۔

میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

صدیق نے بات جاری رکھی اور کہنے لگا:

''سر، رات کو سفر کرتے کام سے تھکے ہوئے تو تھے ہی مگر پریشان بھی تھے کہ کوئی واردات نہ ہو جائے؟''

گھر سے دو کلو میٹر دور ہوں گے کہ تین مسلح افراد نے سڑک پر اچانک سامنے' دائیں اور بائیں بندوق تان کر ہمیں روک لیا۔ نقاب پوش مسلح افراد نے موٹر سائیکل کھڑا کرنے کا حکم دیا تو ہم ڈر کے مارے کچھ بول بھی سکے۔

''تم لوگوں کے پاس جو بھی نقدی ہے اور فون عزت سے حوالے کر دو' کوئی گڑبڑ کی تو فائر مار دیں گے''۔

ایک نقاب پاش نے درشت لہجے میں جب یہ کہا تو ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

میں نے ہمت کر کے اسے مسکین انداز میں کہا:

''ہم لوگ مزدور ہیں اور پکوائی کا کام کرنے کے بعد گھر جا رہے ہیں۔ ہمارے پاس یہ چند سو روپے ہیں آپ رکھ لیں اور ہمیں جانے دیں''۔

میری اس درخواست پر وہ گالم گلوچ پر اتر آیا اور کہنے لگا:

آج تم کہیں نہیں جا سکو گے' کرتے ہیں تمہارا بندوبست''۔

میرا نوجوان بھانجا جواب تک چپ تھا بول پڑا:

''آپ ہمیں گالیاں کیوں دے رہے ہیں جب ہم نے ساری رقم دے دی ہے''۔

یہ سننا تھا کہ وہ شخص طیش میں آ گیا اور اس نے بھانجے کی ٹانگوں پر بھی ڈنڈے مارنے شروع کر دیے۔ میں نے اس شخص کو ٹوکا:

''آپ بچے کو مار کیوں رہے ہیں جب ہم نے آپ سے سیدھی بات کی

ہے۔' جو رقم ہمارے پاس تھی وہ دے دی۔ آپ نے تلاشی بھی لے لی ہے''۔

اس کے باوجود اس کی بدزبانی اور تشدد نہ رکا بلکہ ایک ڈنڈا اس نے میری ٹانگ پر مارتے ہوئے کہا:

''تو اپنی بکواس بند کرتا ہے یا مار کھائے گا''۔

میرے بھانجے نے ان کو منت کے سے انداز میں کہا:

''میرے ماموں کو کچھ نہ کہیں آپ مجھے مار لیں لیکن کم از کم اسے بے عزت نہ کریں''۔

اس کے بعد انہوں نے ہم دونوں کو موٹر سائیکل سے اتارا اور قریبی گنے کے کھیت میں چلنے کو کہا۔ جہاں انہوں نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور دھمکی دی کہ اگر کوئی آواز نکالی تو گولی مار دیں گے۔

وہاں ہماری طرح پہلے سے تین افراد کو انہوں نے باندھ کر بٹھایا ہوا ہے۔

''پریشانی اور خوف کے مارے ہمارا برا حال تھا اور اتنی ذلت محسوس ہوئی کہ آپ کو بتا نہیں سکتا''۔

صدیق کے چہرے پر دکھ اور کرب کو میں واضح طور پر محسوس کر سکتا تھا۔

اس نے بات کو سمیٹتے ہوئے بتایا کہ اچانک سڑک پر فائرنگ کی آواز آئی اور اس کے بعد افراتفری مچ گئی۔ اس کے بعد خاموشی میں ہم دم سادھے کھیت کے اندر بیٹھ رہے۔

آدھ گھنٹے بعد پھر شور ہوا' کوئی کہہ رہا تھا:

''ڈاکو یہاں تھے''۔

ان آوازوں کو ہم پہچانتے تھے۔ یہ ہمارے گاؤں کے افراد تھے۔

ہم نے کھیت کے اندر سے ان کا نام لے کر آوازیں دیں اور شور مچایا کہ ہمیں کھیت

سے نکالو۔

انہوں نے بالآخر ہمیں ریسکیو کیا اور گھر پہنچے۔

''یقین کریں سر۔اس واردات کے دوران جو بے عزتی' ذلت اور رسوائی بغیر کسی قصور کے محسوس ہوئی وہ دماغ سے جاتی ہی نہیں' کیا کریں''۔

صدیق یہ کہتے ہوئے روہانسا ہو گیا۔

''اچھا ہوا ہے سر آپ اس ملک سے جا رہے ہیں۔وہاں آپ کو اس طرح کی واردات کا سامنا ہو گا نہ ڈاکو بے عزت کریں گے۔اللہ آپ کو خوش رکھے''

یہ کہہ کر صدیق کھڑا ہوا' گلے ملا اور ہاتھ ملایا۔میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔

مجھے کینیڈا آئے ہوئے دو مہینے ہوئے تھے۔ایک سٹور پر کچھ ضروری ٹریننگ کے بعد مجھے رات کی شفٹ ملی تھی۔جو رات دس بجے سے صبح سات بجے تک تھی۔رات کی شفٹ اکا دکا گاہک آنے کی وجہ سے خاموش اور بوریت والی تھی وہ بھی خاص طور میرے ایسے نو وارد کے لیے۔

ہفتے کی رات کو الصبح بہت خاموشی ہوتی ہے کیونکہ تمام رات ہلا گلا کے بعد سب گھروں میں سو رہے ہوتے ہیں۔

میں کچھ فلنگ کا کام کر رہا تھا کہ اچانک سٹور میں ایک شخص داخل ہوا۔سٹور کے ایک دو چکر لگانے کے بعد کاؤنٹر کی طرف آیا تو میں نے مخاطب کرنا چاہا کہ اسے کیا چاہیے؟

اس نے بلند آواز میں کہا:

''کوئی حرکت نہ کرنا' میرے پاس چاقو ہے' تم چپ چاپ کاؤنٹر سے دائیں طرف نکل کر زمین پر لیٹ جاؤ''

میرے لیے یہ بہت ہی غیر متوقع صورتحال تھی اور گھبرایا ہوا تھا کہ کیا کروں۔سٹور میں ٹریننگ پر ایسی صورت حال بارے بالکل ذکر نہیں کیا گیا تھا۔

چنانچہ میں نے ایسے ہی کیا' اور آپ کر بھی کیا سکتے ہیں جب کوئی شخص اس طرح اچانک آپ کو دھمکائے اور یہ بتائے کہ تمہارے ساتھ یہ واردات ہو گئی ہے۔

میں موقع سے ہٹ گیا تو اس شخص نے مجھے دیوار کی طرف منہ کرنے کا کہا اور خبردار کیا۔

''مڑ کر نہیں دیکھنا اور خاموش کھڑے رہو ورنہ نقصان کے ذمہ دار تم خود ہو گے''۔

اس کے بعد وہ شخص جلدی جلدی جو کچھ وہ اٹھا سکتا تھا' خاص طور پر کیش اور سگریٹ لے کر سٹور کے دروازے سے بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔

میں کچھ دیر اسی حالت میں کھڑا رہا کہ کہیں وہ دوبارہ اندر تو نہیں آ رہا۔ جب میں نے اس کو نظروں سے اوجھل دیکھا تو میں نے بھاگ کر بیرونی دروازے کی کنڈی لگا دی۔ اس کے بعد کیش کاؤنٹر کو دیکھا تو خالی پڑا تھا۔ سگریٹ کے چند پیکٹ اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ اس واردات کے بارے میں سٹور مینجر کو فون کر کے بتایا تو گہری نیند سے بیدار ہوا اور کہنے لگا:

''کیا کر سکتے ہیں پولیس کو کال کر دو''۔

پولیس کو کال کی تو انہوں نے کہا:

''یہ کوئی ایمرجنسی نہیں ہے۔ اس لیے ان کے ریگولر نمبر پر کال کرو''۔

جب وہاں کال کی تو انہوں نے کہا:

''ہم آفیسر کو بھیج رہے ہیں تم انتظار کرو''

گھنٹہ بھر انتظار کے بعد پولیس کی ایک گاڑی سٹور کے باہر آ کر رکی۔ آفیسر اندر آئے اور ہیلو ہائے کے بعد واردات کی تفصیلات پوچھنے اور ویڈیو کیمرہ کی کاپی بھجوانے کا کہہ کر روانہ ہو گئے۔ جاتے ہوئے ایک کارڈ پر کیس کا نمبر بھی دیا۔

اس اچانک واقعہ کا ذہن پر شدید دباؤ تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا واقعہ بھی ہو سکتا ہے؟

اس بارے اپنی بیگم کو بتانا اور مصیبت تھی کہ وہ پریشان اور خوفزدہ ہو جاتی۔ اس لیے جبر کر کے خاموشی اختیار کیے رکھی۔

ابھی اس واردات کا ذہنی دباؤ اور عدم تحفظ کا احساس کم نہیں ہوا تھا کہ اگلے ہفتے عین اسی وقت رات کے اس پہر ایک اور شخص ہاتھ میں کالا شاپر پکڑے ہوئے تیزی سے سٹور میں داخل ہوا۔

اونچی آواز میں چیخ کر بولا:

''خبردار! تمہارے ساتھ ڈکیتی ہو گئی ہے' کوئی حرکت نہ کرنا اور خاموشی سے زمین پر لیٹ جاؤ''۔

ایک بار پھر یہ اچانک صورتحال بہت ہی خوف ناک تھی' اور اس شخص (ڈاکو) کی ہدایات کو فالو کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا' کیونکہ میں نے ایسے واقعات کے بارے میں کبھی سنا تھا نہ ہی کبھی واسطہ پڑا تھا۔ میں نیچے لیٹا تو اس نے فوراً میری جیبوں کی تلاشی لی۔ اپنا والٹ اور فون بک نکال لی۔ والٹ میں کریڈٹ کارڈ اور کچھ فوٹو آئی ڈی تھیں۔

اس کے بعد اس نے کاؤنٹر سے ٹیلی فون کی تار اپنے پاس موجود چاقو سے کاٹی اور تار سے کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ دیے۔ ایسی صورتحال میں کسی مزاحمت کا مطلب یہ تھا کہ آپ کی جان کو خطرہ بھی ہو سکتا ہے اور یہاں کی پولیس اور انشورنس کمپنیاں اس طرح کی مزاحمت سے باز رہنے کا واضح طور پر کہتی ہیں۔

اس شخص نے جلدی جلدی چند منٹ میں سگریٹ' کیش اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں اپنی جیبوں اور شاپر میں ڈالیں اور تیزی سے میرے پاس سے گزرتے ہوئے دھمکی دی:

''خبردار ہلنا نہیں ہے۔اسی طرح لیٹے رہو''۔

بزر سے معلوم ہوا کہ وہ مرکزی دروازے سے باہر نکل گیا۔

جیسے ہی وہ ڈاکو باہر نکلا' کچھ لوگ جو سٹور کے مستقل گاہک تھے اندر داخل ہوئے اور پوچھنے لگے:

''کیا ہوا' تم ٹھیک تو ہوناں''؟

میں نے ان سے مدد طلب کی گئی کہ میرے ہاتھ کھولے جائیں تو انہوں نے ہاتھ کھولنے کے ساتھ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''ایسا کینیڈا میں نہیں ہونا چاہیے''۔

تب میں نے انہیں بتایا کہ اس شخص نے سٹور کو کس انداز سے لوٹا ہے۔ یہ بھی ذکر کیا کہ پچھلے ہفتے بھی اسی طرح کی واردات ہو چکی ہے۔

ایک شخص نے کہا کہ اس ایریا میں اس طرح کی واردات کا سن کر بڑی حیرت ہوئی ہے۔ایک اور شخص کہنے لگا:

''اس وقت پولیس کی شفٹ چینج ہو رہی ہوتی ہے لہٰذا ایسے وارداتیوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پولیس نہیں آئے گی بھلے ان کو فون بھی کیا جائے''۔

اس واردات کے بارے میں سٹور مینجر کو گھر پہ فون کیا تو وہ بہت افسردہ اور مایوس تھے کہ یکے بعد دیگرے ایسی وارداتیں بہت افسوسناک ہیں۔

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں ان وارداتوں کے بعد ایک ایسے شخص کے ذہنی دباؤ اور پریشانی کی کیا کیفیت ہوگی جو کینیڈا میں زندگی شروع کر رہا ہو کہ یہ سمجھ رہا ہو کہ کینیڈا ایک مہذب اور محفوظ ملک کے طور پر جانا جاتا ہے۔

دوسری واردات میں ڈاکو نے میری جیب سے والٹ اور فون بک نکال لی تھی۔جب وہ جا رہا تھا تو میں نے اس سے درخواست کی تھی:

''میری یہ چیزیں واپس کر دو کیونکہ ان میں کوئی کیش نہیں ہے''۔

لیکن اس نے میری بات پر کان نہ دھرا۔ اس فون بک میں جن دوستوں اور احباب کے نمبر تھے ان میں سے متعدد سے کبھی دوبارہ رابطہ نہیں ہوسکا۔

یکے بعد دیگرے ان وارداتوں کے بعد مجھے صدیق بہت یاد آیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اسے بتاؤں کہ یہاں میرے ساتھ کیا بیتی ہے' لیکن میں نے مصلحتاً ایسا نہیں کیا کہ کینیڈا کے بارے میں اس کا بھرم ٹوٹ جائے گا۔ ان وارداتوں کے بعد مجھے پولیس کے ایک شعبے کی طرف سے کچھ فون آئے جن میں واقعات پر اظہار افسوس کیا گیا۔ سال ہا سال گزر گئے اس کے بعد معاملات پر گرد پڑ گئی' کوئی ڈاکو گرفتار ہوا نہ کوئی کارروائی ہوئی۔ اب بھی کسی سٹور پر ایسی ڈکیتی کی واردات کے بارے میں خبر پڑھتا ہوں تو مجھے اپنے ساتھ ہونے وارداتیں یاد آجاتی ہیں۔

..2

آج کلاس میں ٹیچر ایک آڈیو ٹیپ ریکارڈر لے کر آئے تھے جو انہوں نے ٹیبل پر رکھی اور کلاس کو مخاطب کرتے ہوتے مکمل خاموشی اختیار کرنے کا کہا اور بتایا:

''آج آپ پہلے پوری توجہ سے یہ ریڈیو فیچر سنیں گے اس کے بعد اس پر تبادلہ خیالات ہوگا''۔

مکمل خاموشی کے بعد ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا گیا اور سٹوری شروع ہوگئی۔

ڈیوڈ کو اس اولڈ ہوم میں رہتے ہوئے 10 برس ہو گئے تھے۔ ان کی عمر 85 سال کے لگ بھگ تھی۔

کینیڈا میں مرد حضرات کی اوسط عمر 80 سال جبکہ خواتین میں 85 سال ہے۔ اس لیے ڈیوڈ اوسط عمر سے زیادہ جی رہے تھے۔ اپنے گھر میں رہتے تھے مگر عارضہ قلب سمیت دیگر بیماریوں کی وجہ سے اکیلے رہنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے ڈاکٹرز نے انہیں اولڈ ہوم میں منتقل ہونے کی ہدایت کی تھی۔

دیگر عمر رسیدہ خواتین وحضرات کی طرح ڈیوڈ نے بھی مزاحمت کی کہ وہ اپنا گھر چھوڑ کر اولڈ ہوم نہیں جائے گا لیکن ان کی یہ ضد کسی کام نہ آئی۔ ان کی صحت اور نقل وحرکت کی مخدوش حالت کے باعث ان کا نیا گھر اولڈ ہوم ہی تھا۔ ان کے گھر کو بیچ کر رقم ان کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دی گئی جہاں سے پینشن کی رقم ملا کر ان کے اولڈ ہوم کے اخراجات ادا ہوتے تھے۔

کینیڈا کے زیادہ تر اولڈ ہومز کے یہ مکین جو مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں ایک کمپنی انہیں پیڈ سروسز فراہم کرتی ہے' کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں ان کی مدد کے

لیے ایمبولینس اور سٹاف بھیجا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے مریض کو ایک ڈیوائس دی جاتی ہے جس پر بٹن کو دبانے سے کال ہو جاتی ہے اور عملہ حرکت میں آ جاتا ہے۔

ڈیوڈ کے کمرے سے ایک دن ہیلپ لائن پہ ایمرجنسی کال آئی تو فوری ایمبولینس ڈسپیچ کی گئی۔ پتہ چلا کہ ڈیوڈ کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ان کو فوراً ہسپتال پہنچایا گیا جہاں ڈاکٹرز نے ان کی جان بچانے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے۔

ڈیوڈ کی موت کے بعد اس کے ورثاء کا پتہ چلانے کے لیے ریکارڈ چیک کیا گیا تو پتہ چلا کہ ان کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے لیکن وہ کبھی اسے ملنے نہیں آئے تھے۔ جب بیٹی کو فون ملایا گیا اور بتایا گیا:

''ڈیوڈ ہاسپٹل میں دل کے دورے کی وجہ سے لائے گئے تھے اور ان کا انتقال ہو گیا ہے' کیا آپ ان کی بیٹی ہیں''؟

یہ سن کر فون کی دوسری طرف خاتون نے جواب میں انکار کر دیا کہ ڈیوڈ ان کے والد نہیں ہیں۔ سوری کہہ کر لائن کٹ گئی تھی۔

سٹاف نے یہ فون بند ہونے کے بعد دوسرا نمبر ملایا تو ایک شخص کی ہیلو کے جواب میں سٹاف ممبر نے دریافت کیا:

''آپ مائیکل ہیں؟''

اس پر جواب ملا:

''یس مائیکل سپیکنگ''

جب انہیں بتایا گیا کہ ڈیوڈ نام کا مریض ہاسپٹل میں لایا گیا تھا جو دل کے دورے کی وجہ سے انتقال کر گیا ہے' پھر پوچھا گیا:

''آپ ان کے بیٹے ہیں؟''

مائیکل نے بتایا:

''میرا باپ سے لمبے عرصے سے رابطہ نہیں ہے اور ان کے انتقال کا سن کر

افسوس ہوا مگر میں کہیں دور دراز جگہ پر بہت مصروف ہوں۔ اس لیے ان کے باقی معاملات میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ تھینک یو''۔

اور فون بند ہو گیا۔

ہاسپٹل کے سٹاف نے اس کارروائی کے بعد ایک نوٹ سرکاری طور پر سٹی گورنمنٹ کو بھیجا کہ ان کے پاس ایک لاوارث میت ہے۔ جس کی تجہیز و تکفین کے لیے فنڈز درکار ہیں کیونکہ ان کی کوئی وصیت بھی موجود نہیں ہے۔

ڈیوڈ کی میت سرد خانے منتقل کر دی گئی۔

اگلے دن سٹی گورنمنٹ کی طرف سے لیٹر کا جواب آیا جس میں ڈیوڈ کی تدفین کے لیے مطلوبہ فنڈز منظور کر لیے گئے اور اس کا اپروول نمبر بھی دے دیا گیا تھا۔

فنڈز کی منظوری کے بعد ہسپتال نے ایک فیونرل ہوم سے رابطہ کیا کہ ان کے پاس ایک لاوارث میت ہے جس کی تدفین کے لیے فنڈز دستیاب ہیں۔ وہ اس سلسلے میں ہسپتال سے رابطہ کریں تا کہ میت ان کے حوالے کی جا سکے۔

ضروری کارروائی کے بعد میت اور فنڈز کی منظوری کے لیٹر کی کاپی فیونرل ہوم کے سٹاف کے حوالے کر دی گئی۔ جنہوں نے اپنی گاڑی میں ڈال کر ڈیوڈ کی میت کو قبرستان میں خاموشی سے دفن کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ:

''ڈیوڈ کے انتقال کے بعد اس کی بیٹی اور بیٹے نے باپ سے لاتعلقی کا اظہار کیوں کیا؟''

اس کی وجہ یہ ہے کہ کینیڈا میں فیونرل (تجہیز و تکفین) کے کم از کم اخراجات تین سے چار ہزار ڈالر ہوتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ 30 ہزار ڈالرز ہیں۔

کم از کم اخراجات میں فیونرل ہوم کے اخراجات کے علاوہ قبر کی کھدائی اور پھر بعد از تدفین کچھ اخراجات بھی شامل ہیں۔

جبکہ 30 ہزار ڈالر والی کیٹیگری میں وہ میت اور قبریں شامل ہوتی ہیں جن کی وصیت کے مطابق فیونرل ہوم میں دعائیہ تقریب' سپیشل گاڑی کا اہتمام بعض اوقات میت کا میک اپ خواتین کی صورت میں' اور قبر کی کھدائی کے علاوہ اس پر مہنگے کتبے کی تنصیب شامل ہوتی ہے۔قبر پر پھول بھی باقاعدگی سے رکھنے کا اہتمام اس پیکج میں شامل ہوتا ہے۔

زیادہ تر عمر رسیدہ خواتین اس سلسلے میں انشورنس پیکیج لیتی ہیں۔اخبار میں ان کی وفات کے اعلان کے اشتہار میں تعارف اور خدمات کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔

چونکہ ڈیوڈ کے بیٹے اور بیٹی کے اپنے مالی حالات اچھے نہیں ہوں گے اور انہیں باپ کی تدفین کے لیے مالی وسائل مہیا کرنے میں مشکلات کا سامنا ہوگا۔اس لیے انہوں نے یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ ان کا مرنے والے سے کوئی رشتہ نہیں تھا یا وہ عدم تعلق ہو چکے تھے۔انہیں علم تھا کہ ان کے انکار کی صورت میں بہرحال میت کی تدفین ہو جائے گی۔

گزشتہ چار دہائیوں کے دوران کینیڈا میں فیملی سسٹم کے زوال پذیر ہونے کے بعد اس طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔جن میں ماں باپ اور بچوں کا جوان ہونے کی صورت میں طویل عرصہ تک قریبی رابطہ قائم نہیں رہتا۔وہ والدین سے لاتعلق اپنے کام اور ذاتی زندگی میں اس قدر مصروف ہوجاتے ہیں کہ انہیں والد یا والدہ کی موت سے کوئی واسطہ یا سروکار نہیں رہتا' کہا جاتا ہے کہ مرنا تو سب نے ہے مگر ایسی موت کی صورت میں میت پر رونے والا کوئی نہیں ہوتا۔

آخر میں ریڈیو فیچر میں بیان کی گئی افسوسناک صورتحال کی وجوہات پر کلاس کے شرکاء نے اپنی اپنی رائے دی اور ایسے واقعات کو معاشرتی و اخلاقی زوال بھی کہا۔یہی احساس دلانا کلاس ٹیچر کا مقصد تھا جس کا اظہار انہوں نے اختتامی بیان میں کیا۔

پاکستان میں جب اپنے ایک قریبی عزیز جو پنجاب کی ایک شہری حکومت (سٹی

گورنمنٹ) کے شعبہ تعلقات میں آفیسر تھے' میں نے ان سے اس واقعہ کا اتفاقاً ذکر کیا تو وہ ردعمل میں کہنے لگے

''یہاں پر جب کبھی حکمران جماعت کے کسی تنظیمی عہدے دار کے باپ یا ماں کا انتقال ہو جاتا ہے تو انہیں فون آ جاتا کہ اس موقع پر ان کے گھر پر کرسیاں اور دریوں کا انتظام کیا جائے اور ساتھ ہی کھانے کی دیگیں بھی بھجوائی جائیں''۔

عہدے پر رہنے کے لیے انہیں یہ کام ہر حال میں کرنا ہوتا تھا' اگر وہ کسی تامل کا مظاہرہ کرتے تو اوپر سے فون آ جاتا کہ وہاں یہ لوازمات ابھی تک کیوں نہیں پہنچے؟

کہنے لگے: ''ہر ماہ ایسا کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا تھا''۔

جب ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ ان سروسز کا بل کہاں سے ادا کرتے تھے؟

انہوں نے بتایا:

''ہمارے پاس لاوارث لاشوں کی تدفین کا جو سالانہ فنڈ ہوتا تھا وہ اس میں سے ادائیگی کرتے رہے ہیں''۔

آپ خود اندازہ لگائیں کہ کینیڈا اور پاکستان کے حالات ایسے معاملات میں کس قدر ملتے جلتے ہیں۔

...3

ڈاکٹر تنویر کا تعلق پاکستان کے شہر گوجرہ سے تھا' اور وہ ایک مقامی سرکاری ہاسپٹل میں ڈپٹی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ان کی پرائیویٹ پریکٹس بہت اچھی تھی۔

ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا جو نوعمر تھے اچھے سکول میں پڑھتے تھے۔ان کی بیگم کا تعلق بھی تعلیم یافتہ اور متمول گھرانے سے تھا۔بیگم کے دو سگے بھائی امریکہ میں ڈاکٹر تھے۔

دیکھا گیا ہے کہ ایسی فیملی کا اگر کوئی فرد بیرونِ ملک ہو تو باقیوں کو بھی ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ بھی کسی طرح بیرونِ ملک شفٹ ہو جائیں اور اچھی زندگی کے ساتھ دوسروں کے ہم پلّہ ہو جائیں۔

اسی پس منظر میں ڈاکٹر تنویر نے اپنی اچھی خاصی سرکاری ملازمت اور گڈ لائف سٹائل کے باوجود کینیڈا کی امیگریشن کے لیے اپلائی کیا۔سال بھر کے پراسس کے بعد جب فیملی امیگریشن کے کاغذات ہاتھ میں آ گئے تو ڈاکٹر کے بیوی بچے تو بہت خوش تھے مگر وہ خود کنفیوژ ہو گئے' کیونکہ جس تیزی سے ان کی کینیڈین امیگریشن کا عمل مکمل ہوا انہیں ہرگز امید نہیں تھی۔ڈاکٹر تنویر کی والدہ حیات تھیں اور وہ ان سے بہت اٹیچ تھے۔جب سہمے ہوئے انداز میں ڈاکٹر تنویر نے والدہ سے اپنے کینیڈا جانے کا ذکر کیا تو وہ چپ ہو گئیں۔کچھ دیر خاموش رہ کر کہنے لگیں:

''بیٹا میں نے تمہارے ڈاکٹر بننے کے لیے بہت دعائیں کیں اور اللہ نے کرم کیا تم ڈاکٹر بن گئے۔اللہ نے تمہیں عزت والی سرکاری نوکری بھی

دی''۔

ڈاکٹر تنویر نظریں جھکائے بیٹھا یہ سن رہا تھا کہ والدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا:

''بیٹے! میری طرف دیکھو۔ میں نے بطور سکول ٹیچر جو عزت کمائی ہے اور میں چاہتی تھی کہ آپ بطور ڈاکٹر اس عزت اور نیک نامی میں اور اضافہ کرو گے۔

میں بہت خوش ہوں اور تمہیں دعائیں دیتی ہوں جب عورتیں مجھے آ کر کہتی ہیں کہ میرے بیٹے نے نہ صرف ہسپتال بلکہ پرائیویٹ کلینک پر بھی اچھی طرح چیک کیا ہے بلکہ کچھ دوائیں بھی پاس سے دی ہیں''۔

''ہاں ماں جی! یہ سب عزت اور پیار آپ ہی کی دعاؤں اور تربیت کا صلہ ہے''۔

ڈاکٹر تنویر نے والدہ کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کہہ ڈالا۔

ڈاکٹر تنویر کی والدہ نے اسے پیار کیا اور کہا:

''دیکھو بیٹا! کوئی ماں اپنے بچے کا اپنی نظروں سے دور جانا برداشت نہیں کرتی۔ میں تو سمجھتی ہوں اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہاں رہ کر جو رتبہ' عزت' آسائش اور مالی وسائل دیے ہیں وہ اور کہاں مل سکتے ہیں''۔

''پردیس پردیس ہوتا ہے۔ وہاں زیادہ وسائل ضرور ہوتے ہیں مگر وہاں اپنے ہوتے ہیں نہ اپنائیت''۔

یہ سن کر ڈاکٹر تنویر نے والدہ کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا:

''ماں جی! بات تو ایسی ہی ہے مگر آپ کی دعائیں ہی ہمیشہ میرے کام آئی ہیں۔

میں نے تو ادھر رہنے والے رشتہ داروں سے یہی سن رکھا کہ وہاں زندگی سخت ہے اور سارے چھوٹے موٹے کام خود کرنے پڑتے ہیں' ادھر تمہارے سارے کام ملازم کرتے ہیں۔ وہاں کیسے رہو گے تم میرے بیٹے؟''

یہ کہتے ہوتے والدہ کے چہرے پر پریشانی اور فکر کے آثار تھے۔

ماں بیٹے کی اس بات ملاقات اور مکالمے کا اختتام اس بات پر ہوا کہ والدہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی بوجھل دل کے ساتھ ڈاکٹر تنویر کو کینیڈا جانے کی اجازت دے دی اور ساتھ ہی اپنے آنسوؤں سے تر ڈبڈباتی آنکھوں کو دوپٹے سے ڈھانپ لیا۔ وہ کھل کر رونا چاہتی تھی مگر بیٹے کی محبت میں ایسا نہ کر سکی۔

ڈاکٹر تنویر بھی ماں کو اس حالت میں دیکھ کر جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے ماں کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر رکھا اور تھپتھپایا۔

پھر خاموشی سے سر جھکائے مایوس اور ہارے ہوئے شخص کی طرح وہاں سے باہر کی طرف چل دیا۔

ابھی اس کا ایک پاؤں دروازے کے اندر اور دوسرا باہر تھا کہ والدہ نے پیچھے سے آواز دی:

''رُک جاؤ بیٹا! میں تمہیں آخری بار پیار سے دیکھ تو لوں' یا قسمت یا نصیب''۔

ڈاکٹر تنویر کے پاؤں وہیں رک گئے وہ پتھر سا ہو گیا۔ ماں آنسو پونچھتے ہوتے تیزی سے اس کی طرف بڑھی تو واپس مڑ کر اس نے ماں کو گلے لگایا۔ اس میں اتنی ہمت آ گئی کہ روتی ہوئی ماں کو دلاسہ دینے میں کامیاب ہو گیا۔

''بیٹا! اپنے بھائی اور بہنوں کو اچھے سے مل کر جانا اور وہاں سے بھی رابطہ رکھنا' تم فکر نہ کرنا۔ وہ بیماری شماری میں میرا خیال رکھ لیں گے۔ جاؤ تمہارا اللہ نگہبان ہو''۔

والدہ نے آخری نصیحت کر کے ڈاکٹر کو رخصت کر دیا۔

اپنے گھر میں ڈاکٹر تنویر کے بیوی بچے خوش تھے۔ بیگم پیکنگ پہلے ہی مکمل کر چکی تھی۔ وہ ڈاکٹر تنویر کی والدہ اور دیگر فیملی کے لوگوں سے یہ کہہ کر چند دن پہلے ہی مل آئی تھی۔

''اسے پیکنگ میں کئی دن لگیں گے اور ایسے میں کہیں ان سے ملنا بھول ہی نہ جائے''۔

ڈاکٹر تنویر کے پاس اچھی خاصی سیونگ تھی کیونکہ اس کی پریکٹس بہت اچھی تھی۔ انہوں نے اپنی کچھ پراپرٹی بھی فروخت کر دی تھی تا کہ کینیڈا میں ممکنہ اخراجات کے لیے رقم ساتھ لے جائیں۔

اس طرح کی 5 افراد کی فیملی کو پہلی بار کینیڈا الینڈنگ پر 20 ہزار ڈالر تو بہر صورت ساتھ لے جانا ہوتے ہیں۔ جو ابتدائی چھ ماہ کے اخراجات کے لیے ہوتے ہیں

ڈاکٹر تنویر 50 ہزار ڈالر لے آئے تھے۔ کینیڈا میں ہر نئے آنے والے چاہے وہ ڈاکٹر ہو انجینئر' بینکر ہو یا پھر کوئی کاروباری شخص اسے نئے سرے سے زندگی اور معاملات کو شروع کرنا پڑتا ہے۔

ایڈجسٹ ہونے اور اچھی یا ڈھنگ کی جاب کے حصول میں عام طور پر سال سے دو سال کا عرصہ بھی لگ جاتا ہے

اگلے دن اسلام آباد سے ٹورانٹو کے لیے ان کی الصبح فلائٹ تھی اس لیے وہ رات کو ہی روانہ ہو گئے۔

طویل فلائٹ جب ٹورانٹو ائیر پورٹ پر لینڈ ہوئی' فیملی کے سارے افراد تھکے ہوئے تھے۔

ٹورانٹو ائیر پورٹ پر ڈاکٹر تنویر کے دوست لینے آئے تھے۔ جنہوں نے انہیں سامان سمیت پہلے سے کرایہ پر لیے گئے اپارٹمنٹ میں پہنچا دیا' کچھ کھانے پینے کی چیزیں دوستوں نے پہلے ہی فریج میں رکھ دی تھیں۔

شروع کے دنوں میں دوستوں نے ڈاکٹر تنویر کو گاڑی خریدنے اور بچوں کے سکول میں داخلے کے سلسلے میں کافی مدد کی۔

ڈاکٹر تنویر کے پاس پاکستان سے بنا ہوا انٹرنیشنل ڈرائیورنگ لائسنس تھا اس لیے

انہیں گاڑی چلانے میں کچھ پریشانی نہیں تھی لیکن کچھ ماہ میں انہیں کینیڈا کا ڈرائیونگ لائسنس بھی لازمی حاصل کرنا تھا جس کی وہ تیاری میں بھی لگ گئے۔

پاکستان کے پریکٹسنگ ڈاکٹر کے لیے کینیڈا آ کر جاب تلاش مشکل کام ہوتا ہے۔ دو ہی آپشن ہوتے ہیں وہ ٹیکسی، ٹرک کا لائسنس لے یا پھر سیکورٹی کی جاب کے لیے ضروری ٹریننگ اور امتحان پاس کرے۔ ڈاکٹر تنویر کے دوستوں نے اسے راضی کر کے سیکورٹی کی جاب دلوائی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جاب کیے بغیر آپ کینیڈا میں نہیں رہ سکتے، کیونکہ سیونگ کی رقم یہاں تیزی سے کرائے اور کھانے پینے پر خرچ ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔

بچے سکول جانا شروع ہو گئے اور ڈاکٹر تنویر کو سیکورٹی کی جاب پر بارہ گھنٹے کی شفٹ بھی کرنا پڑتی تھی۔ جس کے عادی نہ ہونے کی وجہ تھک جاتے تھے۔

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ بچے بڑے ہو رہے تھے اور انہیں سکول میں نئے دوست مل گئے تھے۔

ڈاکٹر تنویر کی بیگم گھر کے کام کاج کو دیکھنے کے علاوہ جب بچوں کے قریبی سکول انہیں لینے جاتی تو وہاں انہیں کمیونٹی کی خواتین مل گئیں جن سے وہ فون پر روزمرہ کی زندگی کے بارے بات چیت کر لیتی تھی۔

ڈاکٹر تنویر کے سسرالی امریکہ میں ڈاکٹر تھے اس لیے ان پر شدید دباؤ تھا کہ وہ بھی کینیڈا میں میڈیکل کے امتحانات کی تیاری کریں اور انہیں پاس کر کے لائسنس بھی لیں۔ بطور میڈیکل ڈاکٹر یہاں اپنا کریئر شروع کریں۔

ڈاکٹر تنویر اپارٹمنٹ میں رہ رہے تھے۔ وہ سیکورٹی کی جاب پر کوشش کر رہے تھے کہ کسی طریقے سے امتحانات کی تیاری کر کے کینیڈا کے سٹینڈرڈ کے مطابق فیملی فزیشن کا لائسنس حاصل کریں۔

کینیڈا کی لائف کا سب سے بڑا فیکٹر یہاں کا ماحول اور اس میں رچی بسی

پریشانیاں جس کو ہم سٹریس (ذہنی دباؤ) کہتے ہیں کسی بھی شخص کو سکون نہیں لینے دیتیں، کچھ لوگوں میں سٹریس لیول کم ہوتا ہے اور کئی اس کا بری طرح شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر تنویر کے ساتھ بھی یہی معاملہ چل رہا تھا۔ انہیں پاکستان میں بطور ڈاکٹر اپنی اچھی ملازمت اور پرائیویٹ پریکٹس سے روزانہ کی بڑی آمدن یہاں کی سخت محنت اور کسمپرسی میں بہت یاد آتی تھی۔

اسی دوران انہوں نے تیاری کر کے میڈیکل کا پہلا ایگزام دیا لیکن بدقسمتی سے کامیاب نہ ہو سکے۔ وجہ شاید یہی ہے کہ پڑھنے کی بھی خاص عمر ہوتی ہے اگر آپ 50 سال سے زیادہ ہیں تو آپ کی قوت حافظہ اور محنت کی عادت اس طرح نہیں ہو سکتی جس طرح آپ پہلے کر رہے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر تنویر کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ میڈیکل کے ایگزام میں فیل ہونے کے بعد ان کی طبیعت میں چڑچڑا پن اور پریشانی نمایاں ہونے لگی تھی، اوپر سے اخراجات پورے کرنے کے لیے انہیں سیکورٹی کی جاب پر ساتوں دن لمبی شفٹ کرنا ہوتی تھی۔ ٹورانٹو ایسے بڑے شہر کی گھنٹوں کی پُرہجوم ٹریفک سے بھی وہ تنگ آئے تھے۔

دوسری جانب ان کی بیگم جب امریکہ میں اپنے بھائیوں سے بات کرتی تو وہ پوچھتے تھے:

''ڈاکٹر تنویر کے ایگزام پاس کیوں نہیں ہو رہے؟ انہیں ہر صورت پاس کرنے چاہئیں''۔

اس کا بھی اثر پورے گھر کے ماحول پر پڑتا تھا۔ یوں گھر کے اندر تناؤ کی کیفیت میاں بیوی کے درمیان بھی رہنے لگی۔

بچے زیادہ تر اپنی پڑھائی، دوستوں اور کھیل کود میں مگن رہتے تھے۔

ڈاکٹر تنویر ایک دن جاب سے گھر آ رہے تھے کہ ان کی گاڑی کی دوسری گاڑی سے ٹکر ہو گئی۔ وہ اس نقصان پر بہت پریشان ہوئے اور گھر پہنچے۔ ان کا چہرہ اترا ہوا

تھا۔بیگم نے کھانا رکھا تو انہوں نے ایکسیڈنٹ کے بارے کوئی بات نہیں بتائی کہ اس کو کیا پریشان کرنا ہے۔

بیٹیاں اپنے کمرے میں تھیں اور کسی نے ان کے آنے کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ڈاکٹر تنویر نے دیکھا کہ ان کا بیٹا جس کے ٹرم ایگزام میں گریڈز کم آئے تھے اور اس پر وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکے تھے کیونکہ وہ خود اپنے ایگزام میں ناکام ہونے کی وجہ سے پریشان تھے۔کمپیوٹر پر گیم کھیل رہا ہے تو وہ غصے میں آ گئے اور بیٹے کو برا بھلا کہا:

''تم ہر وقت کھیلتے رہتے ہو' تمہیں پڑھائی یا گھر کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔اب تم بڑے ہو گئے ہو اور تمہیں چاہیے کہ گھر کے مرد کی طرح باپ کے ساتھ حالات کے مطابق چلو''۔

ان کی یہ باتیں سن کر بیگم سے نہ رہا گیا اور وہ کہنے لگی:

''آپ کیا ہر وقت بچوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور خود تو اپنا امتحان پاس کر نہیں پائے اور نہ کوئی ڈھنگ کی جاب کر پائے ہیں''۔

''آپ کی وجہ سے ہم مشکل میں ہیں' ہمارا کوئی سٹیٹس نہیں' لوگ یہاں اپنے گھروں میں رہ رہے ہیں اور ہم ابھی تک اپارٹمنٹ میں پڑے ہیں''۔

ڈاکٹر تنویر کی بیگم نے فل چڑھائی کر دی تھی۔

بیگم کے اس طعن و تشنیع سے ڈاکٹر تنویر کا غصہ جو وہ بیٹے پر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے اور بڑھ گیا۔

میاں بیوی کے درمیان تو تو کار اور سخت جملوں کا تبادلہ ہوا۔جس میں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرایا گیا۔

ڈاکٹر تنویر نے کہا:

''تم مجھے اس ملک میں لے کر آئی ہو حالانکہ ہماری وہاں اچھی بھلی زندگی

چل رہی تھی۔ اتنی اچھی جاب تھی اور یہاں میں نئے سرے سے مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔

یہاں ایگزام پاس کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے نہ ہی یہاں جاب ڈھونڈنا۔ میرے لیے تو ایک مصیبت کھڑی ہوگئی ہے اور تم میری پریشانی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی ہو''۔

ڈاکٹر تنویر بھی پھٹ پڑا

بعض عورتوں کو زعم ہوتا ہے کہ ان کے بھائی بھلے وہ کینیڈا میں ہوں یا امریکہ میں تو وہ کسی دفاعی پوزیشن میں' کمپرومائز کرنے یا مرد کی ذہنی کیفیت اور اس کے حالات سمجھنے کی بجائے اپنی منوانے اور ردّعمل دینے میں خود کو حق بجانب سمجھتی ہیں۔

یہی کچھ اس معاملے میں ہوا خاتون نے اپنے میاں کو جواب میں کھری کھری سنا دیں۔

''تم اس قابل ہی نہیں ہو اور مجھے تمہارے ساتھ ہونا ہی نہیں چاہیے کیونکہ اس ملک میں ایسے زندگی نہیں گزار سکتے''۔

جب لوگ ایسے غصے میں ہوں تو پھر کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ یہی ان کے ساتھ ہوا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ خاتون نے پولیس کو کال کی کہ میرا خاوند تشدد پسند ہے اور ہمیں ٹینشن دے رہا ہے۔ یہ الزام بھی لگا دیا کہ اس ٹارچر میں مینٹل اور فزیکل ٹارچر بھی ہے۔

کینیڈین پولیس تو ایسے معاملے میں فوراً حرکت میں آتی ہے۔

گھر کے پتہ پر پہنچ کر پولیس نے خاتون کی بات سنی اور اس کے بعد ڈاکٹر تنویر کو بچوں کے سامنے گرفتار کر کے ساتھ لے گئے۔

بچے کچھ نہیں کہہ سکے کیونکہ یہاں کے بچوں کو ماں یا باپ سے اس لیول کا لگاؤ نہیں رہتا۔ جس طرح پاکستان میں فیملی سسٹم اور معاشرے میں ہوتا ہے۔

پولیس اسٹیشن میں ڈاکٹر تنویر نے اپنے دوست کو فون کر کے بتایا:

''اس کے ساتھ یہ واقعہ ہو گیا ہے اور وہ اس کی ضمانت کے لیے آئیں اور پولیس سے اس کو رہائی دلائیں''۔

عام طور پہ پولیس ایسے واقعات میں ضمانت پر ملزم کو آئندہ عدالت میں پیشی بھلے وہ چھ مہینے یا سال بعد ہو، رہا کر دیتی ہے۔

لیکن اس کے ساتھ کچھ کنڈیشنز ہوتی ہیں کہ وہ اپنے گھر والوں کو خرچہ دیتے رہیں گے گروسری کے لیے۔ گھر اور اس محلے سے 200 میٹر دور رہیں گے، یعنی گروسری رکھنے کے بعد گھر میں داخل نہیں ہو سکتے۔ فوراً وہاں سے چلے جائیں گے۔ ان شرائط کی خلاف ورزی پر مزید چارج بھی لگ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر تنویر دوست کی مدد سے کسی دوسری جگہ کمرہ شیئر کرنے لگے، ظاہر ہے اپنی پریشانی کے عالم کو وہ خود ہی جانتے تھے۔

کچھ دوستوں نے اس ساری صورتحال میں ڈاکٹر تنویر سے مشورے کے بعد ان کی بیگم کو معافی تلافی اور صلح صفائی پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ یہ آپ کے بچوں کے باپ ہیں۔ آپ دونوں کے حق میں بھی اچھا نہیں ہے۔ آپ لوگ معاملے کو رفع دفع کریں، معاملات کو آگے نہ بڑھنے دیں اور کیس واپس لے لیں۔

کئی دن تک خیر خواہوں نے یہ کوشش کی لیکن خاتون کی اپنے بھائیوں کی مشاورت سے اور ہٹ دھرمی پر مبنی رویے سے صلح کی بات آگے نہ بڑھ سکی۔

ایسے حالات میں ڈاکٹر تنویر کی پریشانی کا کوئی اور اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ وہ کئی دن تک اپنی جاب پر بھی نہ جا سکا جس پر کمپنی نے اسے فارغ کر دیا، کچھ دوستوں نے اس کی مدد کی۔ ان کو رہائش کے لیے جگہ اور پھر چھوٹی موٹی جاب ڈھونڈنے میں مدد بھی کی۔

ڈاکٹر تنویر نے وائیکیوم کلینر جو یہاں پر ایک کارپٹ صفائی کا ٹول ہے ایک دوست کی شاپ پر بیٹھ کر خریداری، مرمت اور فروخت کے بارے میں معلومات اور مہارت

حاصل کر لی۔

بعد میں اسی دوست نے اپنا یہ بزنس انہیں سونپ دیا کیونکہ وہ کوئی اور کام شروع کرنے جا رہا تھا۔

کیونکہ ڈاکٹر تنویر کو ان کے کیس کے سلسلے میں لمبی ڈیٹ ملی تھی جو آٹھ مہینے بعد کی تھی۔ اس دوران خاتون کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کی بچوں سے بھی ملاقات نہ ہو سکی اور نہ ہی بچے ان کا فون اٹھاتے تھے۔

یوں ڈاکٹر تنویر اکیلے رہ گئے۔ انہیں بچوں سے ملاقات کے لیے بھی عدالت سے رجوع کرنا تھا۔

خاتون کو ان کے بھائیوں کی طرف سے سپورٹ حاصل رہی اور انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ اس شخص سے جان چھڑا لی جائے۔ اسی لیے خاتون اور بچوں نے خاوند اور باپ سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ کینیڈا میں کورٹ کے معاملات سال ہا سال چلتے ہیں۔ انہوں نے اس دوران ٹرک چلانے کا لائسنس حاصل کر لیا تھا۔ دکان سیل کر دی تھی اور ٹرک چلانے لگے تھے۔ اپنی انکم سے بیوی بچوں کو سپورٹ بھی کر رہے تھے جس کا انہیں پابند کیا گیا تھا۔

اسی دوران ڈاکٹر تنویر انٹاریو سے مینی ٹوبہ صوبہ اس لیے منتقل ہو گئے کہ انہیں بتایا گیا تھا کہ یہاں کسی فیملی ممبر کو امیگریشن کے لیے بلانے میں پروسیجر آسان ہے۔ ڈاکٹر تنویر نے مینی ٹوبہ رہائش کے بعد اپنی ایک بھتیجی جو پڑھی لکھی تھی کا صوبائی امیگریشن کے پروگرام میں سپانسر کیس فائل کر دیا۔ مینی ٹوبہ میں رہ کر وہ ایک کمپنی کے لیے ٹرک چلا رہے تھے اور اس دوران ان کا دوسرے صوبوں میں بھی آنا جانا رہتا تھا۔

ڈاکٹر تنویر کے کچھ دوست دوسرے صوبے سسکیچوان میں گیس اسٹیشن چلاتے تھے اور وہ اکثر ان کے پاس اپنے ٹرپ کے دوران ٹھہر جاتے اور وقت گزارتے تھے۔

ڈاکٹر تنویر نے رہائش کے لیے مینی ٹوبہ کے شہر ونی پیگ میں ایک اپارٹمنٹ

کرایہ پر لیا ہوا تھا جو ان کا رہائشی پتہ بھی تھا۔ جب ان کا کام نہیں ہوتا تھا تو وہ یہیں قیام کرتے تھے۔

ہمارے ایک دوست جمیل صاحب کو ایک دن ان کے دوست کی کال آئی جو سسکیچوان میں گیس اسٹیشن چلاتے تھے اور یہ وہی دوست تھے جن کے ہاں ڈاکٹر تنویر ٹھہرا کرتے تھے۔ دوستوں نے فون پر کہا:

''جمیل صاحب آپ کی مدد کی ضرورت پڑ گئی ہے''۔

''خیر ہے؟ کس سلسلے میں''۔

جمیل نے استفسار کیا۔

انہوں نے فون پر بتایا:

''ان کے ایک اچھے دوست جو ٹرک چلاتے تھے اور آپ ہی کے شہر میں رہتے تھے۔ ان کا نام ڈاکٹر تنویر ہے۔ ان کی ڈیڈ باڈی ہاسپٹل میں لاوارث پڑی ہے تو آپ ہاسپٹل جا کر پولیس اور انتظامیہ کو بتائیں کہ میں اس شخص کو جانتا ہوں اور میں اس کی میت وصول کرنا چاہتا ہوں''۔

جمیل صاحب اس پر بڑے حیران ہوئے اور پوچھا:

''میں ہسپتال چلا تو جاتا ہوں لیکن میت کے بارے کچھ تفصیل تو بتائیں تا کہ مجھے بھی علم ہو اگر وہ کوئی سوال جواب کریں تو''۔

اس پر گیس اسٹیشن مالک دوست نے جمیل کو بتایا:

''ڈاکٹر تنویر اپنے لوڈ کے ساتھ کسی ٹرک سٹاپ پہ رکے ہوئے تھے جو کہ ونی پیگ کے قریب ہی تھا وہاں ان کو دل کا دورہ پڑا اور وہ ٹرک میں بیٹھے انتقال کر گئے۔ کمپنی نے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا فون نہیں مل رہا تھا کیونکہ شیڈول کے مطابق وہ منزل پر نہیں پہنچے تھے۔ اس کے بعد پریشانی میں ان کی لوکیشن چیک کر کے کمپنی نے مقامی پولیس کو فون کیا اور

مدد کی درخواست کی۔ جب پولیس لوکیشن پر پہنچی تو دیکھا کہ ڈاکٹر تنویر ڈرائیونگ سیٹ پر مردہ حالت میں پائے گئے۔ پولیس نے ان کی باڈی ہسپتال منتقل کردی جہاں ڈاکٹروں نے ان کی وجہ موت تصدیق کردی اور پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی جاری کی ہے''۔

دوست نے بات جاری رکھتے ہوئے مزید بتایا:

''پولیس نے جب کمپنی سے پوچھا کہ اس ڈیڈ باڈی کی فیملی کا کوئی فرد موجود ہے جو میت وصول کر سکے تو انہیں بتایا گیا کہ ان کی فیملی ٹورانٹو میں ہے اور یہ یہاں اکیلے رہتے تھے''۔

اس پر پولیس نے ان کا فون چیک کیا۔ جس سے ان کی فیملی کے نمبر مل گئے۔ سب سے پہلے ان کی بڑی بیٹی سے جب بات کی گئی۔

''میں پولیس سے بات کر رہا ہوں۔ اس نام کا شخص انتقال کر گیا اور اس کی ڈیڈ باڈی ہاسپٹل میں ہے تو آپ کے رشتے میں کیا لگتے ہیں؟''

اس لڑکی نے جواب میں کہا:

''ہمارے کچھ نہیں لگتے۔ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔

فون بند ہو گیا

اس کے بعد فون پر ان کی اہلیہ سے بات کی گئی:

''اس نام کے شخص سے آپ کا کیا تعلق ہے؟''

پولیس کو پتہ تو تھا لیکن وہ پھر بھی تصدیق کے لیے یہ پوچھنا ضروری تھا۔

خاتون نے کسی توقف کے بغیر کہا:

''ہمارے لیے تو وہ بہت پہلے مر چکے تھے''۔

اور فون بند ہو گیا۔

پولیس نے میت کو ''ان کلیمڈ ڈیڈ باڈی'' یعنی لاوارث لاش قرار دے کر ہاسپٹل

کے مردہ خانے میں منتقل کر دیا تھا۔

گیس اسٹیشن والے یہ دوست کیونکہ دوسرے صوبے میں رہتے تھے اور وہ خود تو نہیں آ سکتے تھے لہٰذا انہوں نے جمیل صاحب سے رابطہ کیا تھا۔ جمیل یہ تفصیل سن کر بہت افسردہ ہوا اور ہسپتال جا کر انتظامیہ کو ملا۔ جنہوں نے پولیس سے بات کروائی تو چند ضروری کاغذات پر دستخط لینے کے بعد ڈاکٹر تنویر کی میت جمیل صاحب کے حوالے کر دی گئی۔

جمیل صاحب نے اس سے پہلے مقامی اسلامی تنظیم سے میت کی نماز جنازہ اور تدفین کے معاملے میں بات کی تھی۔ اس لیے ایمبولینس میں میت سیدھی اسلامک سینٹر پہنچا دی گئی۔ جہاں ظہر کے وقت آنے والے نمازیوں کی شمولیت سے ان کی نماز جنازہ ادا کر دی گئی۔ ان کی قبر اور تدفین کے لیے دوستوں نے اخراجات کا بندوبست کیا تھا جس کے بعد انہیں مقامی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

جمیل نے دوستوں کے دیے ہوئے پتہ پر ایک دن بعد اس اپارٹمنٹ کی مینجمنٹ سے رابطہ کیا اور بتایا کہ ڈاکٹر تنویر کا انتقال ہو گیا ہے اور یہ ان کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ ہے۔ پراپرٹی مینجمنٹ کے ساتھ مل کر اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا گیا۔ وہاں ان کی استعمال کی جو اشیاء تھیں ان کو وہاں سے نکال کر مقامی ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ان کے بقیہ واجبات کی ادائیگی کر دی گئی۔

یوں ڈاکٹر تنویر کی زندگی کا جو شاندار باب پاکستان سے شروع ہوا تھا' کینیڈا میں ایک لاوارث میت کی حیثیت سے بند ہو گیا۔

...4

کرسچین لاڈو کا تعلق سوڈان سے تھا۔ کلاس روم میں اس کے علاوہ ایک نوجوان افریقی خاتون جس کا نام چیکا تھا نائیجیریا سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ سینئر تھی اس لیے دو ماہ میں کلاس سے انٹرن شپ کے لیے چلی گئی۔

کرسچین لاڈو دیگر افریقی النسل لڑکوں کی طرح لمبے قد کا سبک رفتار انسان تھا۔ وہ کلاس میں باقاعدگی سے آ کر سوال و جواب میں شامل ہوتا تھا۔

اچانک کرسچین لاڈو کلاس میں سے غیر حاضر ہو گیا۔ ٹیچر کو اس بارے میں انتظامیہ کی طرف سے کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔

ہفتہ بعد لاڈو اچانک کلاس میں آیا تو ٹیچر نے اس کو باہر بلایا اور کچھ دیر بعد وہ دونوں کلاس روم میں واپس آ گئے۔ لاڈو دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

دو گھنٹے بعد بریک ہوئی تو لاڈو مجھ سے گزشتہ ہفتے میں ہونے والے کلاس ورک کی کاپی کی درخواست کرنے لگا۔ میں کہا:

''کوئی مسئلہ نہیں دے دوں گا''۔

جب کلاس دوبارہ شروع ہوئی تو ٹیچر نے کلاس کو مخاطب کیا اور بولے:

''کرسچین لاڈو آپ سب کو کچھ اہم باتیں بتانا چاہتا ہے۔ اس کی بات کو غور سے سنیں''۔

اس اعلان پر لاڈو ٹیچر کی کرسی پر بیٹھ گیا اور ٹیچر سامنے سٹوڈنٹس کے ساتھ اسے سننے کے لیے بیٹھ گئے۔

کرسچین لاڈو نے اپنی کہانی شروع کی کہ وہ سوڈان میں پیدا ہوا۔ جب چھوٹا تھا تو اس کی والدہ بیماری کی وجہ سے فوت ہوگئی۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا جس کی عمر چھ سال تھی خود اس کی عمر تقریباً 12 سال تھی' کچھ عرصہ بعد اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی اس کی سوتیلی ماں اپنے ساتھ دو بچے لے کر آئی تھی۔ جو اس کے پہلے خاوند سے تھے۔ کرسچین لاڈو نے بتایا کہ اس کا باپ مزدور آدمی تھا اور سارا دن باہر کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتا تھا۔

اس نے ہم دونوں بھائیوں کے معاملات سوتیلی ماں کے ہاتھ میں دیے ہوئے تھے۔ سوتیلی ماں کا یہ عالم تھا کہ جب کھانا پکتا تو وہ ہمارے دونوں کے ہاتھ باندھ دیتی تھی اور اپنے بچوں کو کھانا کھلاتی تھی اور پھر بچا کھچا کھانا ہمیں دیتی تھی۔ جب کھانا نہیں بچتا تھا تو ہم بھوکے رہتے تھے۔

باپ کو بتایا تو اس نے اس کا کوئی سوتیلی کو کہا بھی مگر کچھ اثر نہیں ہوا۔

''پتہ نہیں وہ عورت کس مٹی کی بنی تھی کہ ہم بچوں کو بھوک سے مرنے کے لیے چھوڑ دی دیتی تھی''۔

یہ کہتے ہوتے لاڈو کے چہرے پر غصہ اور کرختگی دیکھی جا سکتی تھی۔

کرسچین لاڈو نے بات جاری رکھی اور کہا کہ بڑے بھائی ہونے کی حیثیت سے اسے سب سے زیادہ دکھ اپنے چھوٹے بھائی کو کھانا نہ ملنے کا ہوتا تھا۔ وہ خود باہر چلا جاتا تھا لیکن چھوٹا بھائی باہر جانے کے قابل نہیں تھا۔ سوتیلی ماں کے اس ظالمانہ رویے سے تنگ آ کر وہ باہر سے کچھ درختوں سے پھل اور پتے جن میں کیلے وغیرہ شامل تھے ڈھونڈ کے لاتا اور اپنے چھوٹے بھائی کو کھانے کے لیے دیتا۔ یوں خود چھوٹے بھائی کے لیے ماں بن گیا تھا۔

اس پر بھی سوتیلی ماں کو بہت اعتراض ہوتا اور وہ اس سے چھین بھی لیتی تھی۔ اسے

ہم بچوں پر ذرا بھی ترس نہیں آتا تھا۔ سوتیلی ماں پر اسے شدید غصہ آیا۔ اس نے اپنے باپ کی بندوق اس پر تان لی اور فائر بھی کر دیا۔ جو اس کو نہیں لگا اور وہ خوش قسمتی سے بچ گئی۔ اس واقعے کے بعد اس پر بہت تشدد کیا گیا بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گھر سے بھاگ جائے گا۔ وہ بھاگ کر ایک رفاعی ادارے کے کیمپ میں چلا گیا۔ اس کیمپ بارے میں محلے کے ایک لڑکے نے اسے بتایا تھا۔

کیمپ کو سعودی ریلیف ایجنسی چلا رہی تھی جہاں اس نے خود کو یہ کہہ کر رجسٹر کروایا کہ وہ یتیم ہے۔ اس کے ماں باپ نہیں ہیں اور وہ لاوارث ہے۔ اس ایجنسی نے اسے رہنے کے لیے جگہ دی اور کھانا بھی فراہم کیا جاتا تھا۔ جس میں کھجوریں اور دیگر غذا شامل تھی۔ کیمپ میں رہائش کے دوران اسے اپنا چھوٹا بھائی بہت یاد آتا تھا کہ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگا؟ اس نے کچھ کھایا بھی ہے یا بھوکا ہی ہے۔ ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا اور میں واپس گھر گیا اور چوری چھپے اپنے چھوٹے بھائی جو بہت بری حالت میں تھا کو وہاں سے نکال لایا۔ میں نے اسے بھی کیمپ میں رجسٹر کرا دیا۔ اب مجھے اطمینان ہوا کہ وہ بھوکا نہیں سوئے گا۔ کیمپ میں رہتے ہوئے چھ ماہ گزر گئے تھے۔ کرسچین نے بتایا کہ اس کی ملاقات ایک ایسے نوجوان سے ہوئی جو وہاں سے کینیا جا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہاں سے بیرونِ ملک جانا آسان ہوگا۔ کرسچین بھی اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا۔

اس مقصد کے لیے مزدوری کر کے اس نے کچھ رقم جمع کر لی تھی۔ ایک دن اس نے اس نوجوان کے ساتھ کیمپ سے روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔

جاتے ہوئے چھوٹے بھائی سے لپٹ کر ملا اور اسے دلاسہ دیا

''بہت جلد واپس آئے گا''۔

بوجھل دل کے ساتھ وہ بس میں بیٹھے چیک پوسٹ پر حکام کو رقم دی اور نکل گئے۔ اور بالآخر نیروبی کینیا میں ایک مہاجر کیمپ میں جا پہنچے۔ جہاں اقوام متحدہ کے زیر انتظام

اس کیمپ میں خود کو رجسٹر کروانا ایک بڑا قدم تھا۔

اس کے لیے ہم نے ان کو ایک سٹوری بنائی کہ ہم کس طرح سوڈان سے اپنی جان بچا کر یہاں پہنچے ہیں۔ ہماری سٹوری سن کر ہمیں کیمپ میں رجسٹرڈ کر لیا گیا' یہ بہت بڑا کیمپ تھا جہاں ہزاروں کی تعداد میں افریقہ کے مختلف حصوں سے مرد و خواتین بچوں سمیت مقیم تھے۔

انہیں رہائش اور کھانے کی سہولتیں میسر تھیں۔اس دوران کرسچین لاڈو نے کیمپ کے اندر درزی کا کام سیکھ لیا اور وہ اس کام میں بہت جلد ماہر ہو گیا۔

وہ کیمپ کے اندر اور باہر فٹ بال کھیلنے بھی لگا تھا۔ایک اچھا کھلاڑی ہونے کی وجہ سے اس کو توجہ بھی ملنے لگی۔

کرسچین لاڈو نے بتایا کہ کیمپ میں لوگوں کی رجسٹریشن بھی ہوتی تھی کہ جن کو کچھ کام آتا ہے۔ ان کا سکل لیول ٹیسٹ کرنے کے بعد دوسرے ملکوں میں بطور مہاجر ریفیو جی منتقل کرنے کی لسٹ میں نام درج کیا جاتا ہے' کچھ دن تگ و دو کے بعد کرسچین لاڈو کا نام بھی اس لسٹ میں شامل ہو گیا۔اس دوران وہ ایک درزی کی حیثیت سے نیروبی کے اس کیمپ کے گرد و نواع میں واقع درزی کی دکانوں پر چلا جاتا اور وہاں عارضی طور پر کام کر کے اچھی رقم بھی بنا لیتا تھا۔اس کے کام میں بھی مزید بہتری آ گئی تھی کہ کون سا فیشن چل رہا ہے اور ان دکانوں پر گاہک کہاں سے آتے ہیں؟

اس کے بعد وہ خود ان گاہکوں کے رابطے میں آ گیا اور گھروں سے کپڑوں کی سلائی کے آرڈر لینے لگا۔گائے بگا ہے وہ کیمپ کے ایڈمن آفس میں مختلف ملکوں میں بننے والی ریفیو جی لسٹ پر پیشرفت کا بھی پتہ چلاتا رہتا تھا۔

لاڈو نے مزید بتایا کہ وہ ایک گھر میں باقاعدگی سے سلائی کے کپڑے دینے جایا کرتا تھا۔وہاں گھر میں کام کرنے والی نوجوان لڑکی میں اس کی دلچسپی اس لیے ہو گئی کہ

گھر والے اس سے اچھا سلوک نہیں کرتے تھے اور زیادہ کام بھی لیتے تھے۔

''مجھے اس پر بہت افسوس ہوا اور ترس بھی آیا''۔

یہ کہتے ہوئے لاڈو کے ہمدردی کے جذبات ابھر آئے تھے۔

کچھ عرصے میں اسے محسوس ہوا کہ یہ وہ لڑکی اس کی ہمدردی کو محسوس کر رہی ہے' تو کرسچین نے اسے باہر ملنے کو کہا تو وہ راضی ہوگئی۔ وہ جب باہر ملے تو کرسچین نے اسے پیشکش کی کہ اگر وہ شادی کرنا چاہتی ہے تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔

کچھ ملاقاتوں کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہم شادی کر لیتے ہیں۔ کرسچین لاڈو ان دنوں اچھا درزی ہونے کی وجہ سے خوب رقم کما رہا تھا اس لیے وہ شادی کا بوجھ اٹھا سکتا تھا' لہٰذا اس نے کیمپ سے نکل کر ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا جہاں وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہنے لگا۔

ایک سال بعد اس کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی تو بہت خوش ہوا کہ وہ صاحب اولاد ہو گیا ہے۔

کرسچین نے ایک دلچسپ بات بتائی کہ اس کی مالی حالت اچھی تھی اس کی چھوٹی بچی پیمپر لگاتی تھی۔ ایک دن جب وہ اچانک باہر گلی میں گئی تو اس کا پیمپر ہی کسی اتار لیا۔ یہ سوچ کر کہ وہ اس کو کہیں فروخت کر دے گا۔ جب بچی گھر آئی تو اسے اندازہ ہوا کہ یہ حرکت کیمپ میں سے کسی کمینے چورنے کی ہے کیونکہ ان کا اپارٹمنٹ ریفیوجی کیمپ کے قریب ہی تھا۔

کرسچین لاڈو نے دُکھ سے بتایا کہ اسے بہت افسوس ہوا جب اسے پتہ چلا کہ اس کی بیوی کی اپارٹمنٹ کے مالک کے ساتھ ساز باز ہے اور اس نے ناجائز تعلقات بھی استوار کر رکھے ہیں۔

کرسچین نے اپارٹمنٹ مالک سے الجھنے کی بجائے بیوی کو برا بھلا کہہ کر اس جگہ

سے کسی اور جگہ منتقل ہونے میں عافیت سمجھی۔

بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب کرسچین لاڈو کی قسمت نے یاوری کی اور اس کا نام اس ریفیوجی گروپ میں آ گیا جسے کینیڈا کی حکومت نے اپنے ہاں منتقل ہونے کی منظوری دے دی تھی۔

ایک ماہ سے بھی کم عرصہ میں کرسچین لاڈو، اس کی بیوی اور بیٹی کی فلائٹ کا بندوبست ہو گیا۔ ان کی منزل کینیڈا کا صوبہ اونٹاریو تھا۔

لاڈو نے بتایا کہ جیسے ہی اس نے ٹورانٹو ائیر پورٹ پر اترنے سے پہلے نیچے بلند و بالا عمارتوں کا منظر دیکھا تو وہ پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا کہ وہ کینیڈا ایسے ترقی یافتہ ملک میں اس طرح پہنچ جائے گا۔ وہ بہت خوش اور خدا کا شکر بجالا رہا تھا کہ کہاں سوڈان کے دور دراز علاقے میں بے آسرا، بھوکا پیاسا غیر یقینی حالات میں بچپن اور لڑکپن گزارتا بالآخر کینیڈا لینڈ کر گیا ہے۔ اس کے لیے یہ معجزہ سے کم نہ تھا'' لاڈو نے اپنے جذبات کا کھل اظہار کیا تو کلاس میں سے کسی نے تالی بجائی تو سب نے مل کر تالیاں بجا کر اس کا حوصلہ بڑھایا۔

کرسچین لاڈو نے بات کو اگلے مرحلے میں داخل کرتے ہوئے کہا کہ اسے پورا یقین تھا کہ وہ جس قدر محنتی، پُرجوش اور صلاحیتوں کا مالک ہے، کینیڈا میں اپنا مستقبل روشن بنا لے گا۔

ٹورانٹو میں ہفتہ بھر ایک ہوٹل میں قیام کے بعد وہ شمالی اونٹاریو کے قصبے تھنڈر بے میں شفٹ ہو گیا۔ لاڈو نے بتایا کہ تھنڈر بے ایک چھوٹا قصبہ ہے۔ جہاں کم آبادی کے ساتھ روزگار کے مواقع بھی محدود تھے۔ اس شہر میں انہیں حکومت کی طرف سے رہائش، روزمرہ کے استعمال کی اشیاء اور فرنیچر تک فراہم کیا گیا۔ ایک اچھی رقم خرچ کے لیے مل رہی تھی مگر وہ کام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پارٹ ٹائم جاب اور انگلش سیکھنا شروع کر دی۔

لاڈو نے مزید بتایا کہ وہ فٹ بال کا کھلاڑی ہونے کی وجہ سے مقامی ٹیم میں اچھے کھلاڑی کے طور پر مقبول ہو گیا۔

کھیل کے ذریعے وہ دوسری کمیونٹیز میں اپنا اثر ورسوخ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

ایک سال گزرا تو اس نے محسوس کیا کہ اسے کہیں اور بہتر روزگار اور طرز زندگی کے لیے شفٹ ہونا چاہیے۔ اس کی ملاقات کھیل کے دوران بننے والے ایک افریقی دوست سے ہوئی۔

وہ بھی اسی کی طرح سوچ رہا تھا۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ قریبی صوبہ مینی ٹوبہ کے شہر ونی پیگ شفٹ ہو جاتے ہیں جہاں روزگار کے ترقی کے بہتر مواقع موجود ہیں۔

کرسچین لاڈو نے ونی پیگ میں اپنی آمد کا بتاتے ہوئے کہا کہ اس کی بیوی اور بیٹی تھنڈر بے سے رخصت ہوتے ہوئے اداس تھے کہ پتہ نہیں وہاں کیسے لوگ ہوں گے اور نئے دوست بنانے پڑیں گے۔

نئے شہر آ کر اس نے شہری حکومت سے رہائش کے سلسلے میں مدد طلب کی اور جو اسے مل گئی۔ اس کے لیے ایک رہائش کا بندوبست ہو گیا کیونکہ یہاں پر سوڈان سے تعلّق رکھنے والی کمیونٹی بڑی تھی۔ زندگی اچھی لگنے لگی اور اس دوران اس کا ایک بیٹا بھی پیدا ہوا۔ جس پر وہ بہت خوش ہوا کہ اس کا چھوٹا خاندان مکمل ہو گیا۔ کینیڈا کی حکومت چائلڈ سپورٹ کی مد میں فنڈز فراہم کرتی ہے۔ اس لیے بچوں کے کھانے پینے اور پہنے کے معاملے میں اسے کوئی پریشانی نہیں تھی۔

کرسچین لاڈو کے چہرے پر ایک اطمینان سا تھا اور وہ بولتا چلا جا رہا تھا۔

''خواب دیکھنے پر ہر انسان کا حق ہے اور اس پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ اسے یقین تھا کہ اسے ایک دن اچھی جاب مل جائے گی اور وہ اپنا گھر بھی خرید سکے گا''۔

یہ کہہ کر اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور دکھی سا ہو گیا اور بولا:

''آپ سوچ کچھ اور رہے ہوتے ہیں اور حقیقت میں کچھ اور ہوتا ہے''۔

جس محلے میں وہ رہتا تھا اس کی بیوی نے وہیں کسی اور افریقی لڑکے سے راہ و رسم بڑھا لی جس کا علم اسے کچھ عرصے بعد ہوا۔ لاڈو نے بیوی کو بچوں سے علیحدہ کر کے اس بارے میں دریافت کیا۔ پہلے تو مان نہیں رہی تھی پھر اس نے اس بات کا اقرار کر لیا کہ وہ کسی سے تعلقات میں ہے۔

کرسچین لاڈو نے اپنی بیوی کو یاد دلایا کہ اس نے یہی حرکت کینیا میں بھی کی تھی اور اس کی معافی تلافی کے بعد اس نے دل بڑا کر کے اسے معاف کر دیا تھا۔

یہاں آ کر اس نے یہ حرکت کر کے ایک بار پھر سے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اس بے وفائی کو بار بار برداشت کرنا بہت مشکل بات ہے' لیکن پھر بھی کرسچین لاڈو نے بچوں کی خاطر اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس تعلق سے باز آ جائے تا کہ وہ اپنی خوشحال زندگی کے خواب کی تعبیر پا سکے۔

لاڈو نے بتایا کہ:

اس باز پرس اور درخواست پر اس کی بیوی نے الٹا یہ کہہ کر اسے موردِ الزام ٹھہرا دیا:

''وہ کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہیں کر سکا اور وہ کوئی خوشحال زندگی بسر نہیں کر پا رہی تو اس کا حق ہے کہ وہ کسی ایسے شخص سے تعلق رکھے جو اس کے خوابوں کو پورا کر سکے''۔

کرسچین لاڈو کے لیے یہ بات سوہانِ روح تھی کہ وہ عورت اس کے سامنے اس طرح سے کھڑی ہو گئی ہے۔ جس کو اس نے ترس کھا کر ایک گھر کے مظالم سے نجات دلائی اور شادی کر کے بیوی بنایا۔

دونوں کے درمیان تلخی اتنی بڑھی کہ بات مار کٹائی تک آ گئی۔

اس کے بعد کیا تھا بیوی نے پولیس کو کال کی کہ اس نے تشدد کا نشانہ بنایا ہے۔

پولیس نے آ کر اسے گرفتار کیا اور ضمانت پر رہائی کے بعد پابند کر دیا کہ وہ دوبارہ گھر نہیں جا سکتا۔

کرسچین لاڈو یہ بتاتے ہوئے اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

پوری کلاس میں افسردگی چھا گئی تھی۔ ٹیچر نے اُٹھ کر اسے دلایا دیا اور سوری کہا تو لاڈو نے پھر سے بتانا شروع کیا:

''اس واقعہ کے بعد میری یہ حالت ہو گئی کہ میں پھر ایک دفعہ بے یار و مددگار ہو گیا اور میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ میں کس قدر اذیت کا شکار اور دکھی مارا مارا رات بھر پھرتا رہا۔ میرا دل چاہا کہ وہ خودکشی کر لوں لیکن میں ایسا نہیں کر سکا کیونکہ مجھے اپنے بچوں سے محبت تھی اور میں ان کے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا''۔

لاڈو رُندھی ہوئی آواز میں بولتا گیا:

''ایک دن بچوں کو بہت مس کر رہا تھا اس لیے شام کو نہ چاہتے ہوئے بھی ادھر چلا گیا کہ گراؤنڈ میں کھیلتے بچوں کو دیکھ لوں گا' بہت دیر وہاں بیٹھا رہا مگر بچے اس دن ادھر آئے ہی نہیں۔ میرا دل بجھ گیا جس سے میں اور دکھی ہو گیا۔

اسی کیفیت میں بیٹھے ہوئے اندھیرا چھا گیا اور مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کہاں جاؤں۔

کیا دیکھتا ہوں کہ چار لڑکوں کے گروپ نے اندھیرے میں مجھ پر حملہ کر دیا اور مجھ پر تشدد کرنے کے بعد فرار ہو گئے۔

زخموں سے چور تھا کہ ایک راہ گیر نے میرے لیے ایمبولینس کال کردی۔جس میں مجھے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔وہاں پوچھ گچھ پر میں نے بتایا کہ مجھ پر کچھ لوگوں نے حملہ کیا ہے۔پولیس نے رپورٹ تو لکھ لی لیکن کچھ نہیں ہوا نہ ہونا تھا''۔

کرسچین لاڈو نے بتایا کہ اسے اب وکیل کے ذریعے عدالت سے بچوں سے ملاقات کی اجازت مل گئی تھی اور وہ وکیل کی موجودگی میں بچوں سے ملاقات کرنے لگا تھا۔پہلی بار بچوں سے مل کر وہ خود بھی بلک بلک کر رویا اور بچے بھی روتے رہے۔

لاڈو کی کہانی جاری تھی سب انہماک سے سن رہے تھے مگر ٹیچر اَب گھڑی کی طرف بھی بار بار دیکھ رہے تھے کہ کلاس کا ٹائم ختم ہونے سے پہلے وہ اپنی بات ختم کر سکے گا یا نہیں۔

کرسچین لاڈو کو اس کی شاید پروا نہیں تھی۔اس لیے وہ بولتا چلا جا رہا تھا۔

کہنے لگا:

''ایک دفعہ ملاقات میں میرے بیٹے نے بتایا کہ اس کی ماں اسے بہت مارتی ہے۔جب میں نے اس کا کپڑا اہٹا کر دیکھا تو بچے کے جسم پر تشدد کے نشان تھے۔اس پر وہ بہت دکھی اور جذباتی ہوا اور میں نے اپنے وکیل کے ذریعے پولیس سے شکایت کی کہ بچوں پر تشدد ہو رہا ہے''۔

کرسچین کے آنسو پھر ٹپ ٹپ گرنے لگے مگر پھر بھی وہ بول رہا تھا:

''میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ میں کس کرب اور اذیت سے گزر رہا ہوں اور میں اس دن کو کوستا ہوں جب میں نے ایسی عورت سے شادی کی جس کے حسب نسب کا مجھے پتہ نہیں تھا۔میں نے اس پر ترس کھایا اور مجھے یہ دن دیکھنے پڑے''۔

اس کے بعد کرسچین لاڈو نے اپنی حالیہ دنوں میں گرفتاری اور جیل جانے کے بارے میں بتایا کہ اس کی بیوی نے اس کے خلاف پولیس میں غلط طور پر رپورٹ کی تھی کہ میں اس کو دھمکیاں دے رہا ہوں اور اس کے گھر داخل ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔

اس شکایت پر پولیس نے مجھے اچانک گرفتار کر کے جیل پہنچا دیا جہاں ایک ہفتے کے بعد مجھے رہائی ملی ہے اور میں آپ کے سامنے بات کر رہا ہوں۔

پوری کلاس میں اس کی دردناک کہانی سے ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر ایک کو اس کے حالات پر گہرا دکھ اور افسوس تھا۔ جیسے ہی ٹیچر نے کلاس کے اختتام کا اعلان کیا تو زیادہ تر کلاس فیلوز نے کرسچین لاڈو کو گلے لگایا اور دلاسہ دیا۔

بعد میں کرسچین لاڈو کبھی کبھار مجھ سے گپ شپ کرتے ہوئے ایک ڈالر مانگ لیتا تھا کہ اس نے کافی پینی ہے۔ ساتھ میں یہ بھی کہتا کہ میں آپ کو واپس کر دوں گا تو میں اکثر اسے ایک ڈالر دے دیا کرتا تھا اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ یہ واپس کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور نہ ہوگا' کیونکہ مجھے اس کے حالات کا اندازہ ہو چکا تھا۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ تمہارے نام کا آخری حصہ لاسٹ نیم کیا ہے؟ پہلے نام کی تو سمجھ آتی ہے دوسرا کیا ہے؟

اس نے کہا:

''مجھے یاد ہے میرے والد نے بتایا تھا کہ ہمارے ہمسائے میں ایک بھارتی شخص رہتا تھا اس نے میرے نام کے ساتھ لاڈو لگا دیا تھا''۔

میں نے پوچھا:

''اس کا مطلب کیا ہے؟''

اس نے کہا:

''یہ کسی مٹھائی کا نام ہے''

''او!''۔میرا ماتھا ٹھنکا۔میں نے اسے کہا:

''یہ نام لڈو ہے جسے تم لاڈو کہہ کر پکارتے ہو' کیونکہ لڈو ہی ہندوستان میں مشہور مٹھائی ہے''۔

یہ سن کر اس نے تائید کی کہ ایسا ہی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ میں کسی دن تمہارے لیے لڈو لے کر آؤں گا۔وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ لڈو شہر میں مٹھائی کی دکان پر ملتے ہیں۔

چند دنوں بعد میں نے ایک پاؤنڈ لڈو سٹور سے لیے اور کلاس کے سامنے اس کو دیے کہ یہ اس کے لاسٹ نیم کی مٹھائی ہے۔

اس پر وہ بہت خوش ہوا اور جلدی سے ایک لڈو اٹھا کر منہ میں ڈال لیا' پھر اونچی آواز میں شکریہ ادا کرنے لگا۔اس کے چہرے پر ایک عجیب خوشی اور تشکر نمایاں تھا۔

بدقسمتی یہ ہوئی کرسچین لاڈو اپنے دگرگوں حالات اور ذہنی تناؤ کی وجہ سے کوشش کے باوجود کمیونٹی سپورٹ کے اس پروگرام کو جاری نہ رکھ سکا کیونکہ اس کے کچھ ہفتہ وار ٹیسٹ مس ہو گئے تھے اور وہ مطلوبہ جی پی اے بھی برقرار نہ رکھ سکا۔جس پر کالج نے اس کو ڈراپ کر دیا تھا۔

...5

کینیڈا میں گریجویشن کے بعد ملنے والی جاب پر آج میرا پہلا دن تھا۔ دفتر کا تمام سٹاف جو خواتین پر مشتمل تھا' اس سے میرا تعارف کروایا گیا تھا۔

ایک صاحب 10 بجے کے بعد آفس میں آئے تو سب ان کو فریڈ کہہ کر پکار رہے تھے۔ فریڈ کو میرے بارے مینجر کولین نے بتایا:

''یہ ہمارے نئے کولیگ ہیں۔ آج ان کا پہلا دن ہے''۔

فریڈ نے بھی مجھے ہائے کہا اور ویلکم کیا۔

اس کے بعد میں نے نوٹس کیا کہ فریڈ ہفتے میں ایک بار آفس آتا ہے اور باقی دن نظر نہیں آتا۔

میں نے جب اس بارے میں خاتون سپروائزر سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ فریڈ ایک کلائنٹ کے ساتھ ہے اور سیدھا اس کے گھر جا کر پورا دن جاب پر سپورٹ کرتا ہے۔ اپنے پورے ہفتے کی حاضری لگانے کے لیے صرف سوموار کے دن دفتر آتا ہے۔

اگلے سوموار جب فریڈ آیا تو میں نے خاص طور پر اس سے ملاقات کی اور کچھ گپ شپ بھی کی۔

فریڈ کی عمر یقیناً 55 / 60 سال کے درمیان ہوگی۔ سفید بال اور چہرے کا پکا رنگ آپس میں میل نہیں کھاتے تھے کہ یہ شخص کینیڈا میں پیدا ہوا ہوگا' لیکن اس کی انگلش بول چال بالکل گوروں جیسی تھی۔

فریڈ کو میں نے بتایا کہ میں پاکستان سے ہوں اور یہ میری پہلی جاب ہے تو آپ مجھے کچھ بتائیں کہ دفتر کے حالات کیا ہیں اور مجھے کس طرح کام کرنا چاہیے؟ میرے

سوال پر فریڈ نے جواب میں کہا:

''آپ چونکہ اس آفس میں نئے ہیں دفتر میں زیادہ تر خواتین ہیں اور ہم دو مرد سٹاف کا حصہ ہیں۔ میں آپ کو اپنے تجربے کی روشنی میں یہ نصیحت کروں گا کہ اپنے دیے گئے کام کے علاوہ اپنی طرف سے اضافی طور پر کچھ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جتنا سوال اتنا جواب۔ یہاں کے ورک پلیس کا یہی دستور ہے''۔

فریڈ نے یہ کہتے ہوتے آواز آہستہ رکھی تا کہ کوئی اور نہ سن سکے کہ ہم کیا بات کر رہے ہیں۔

اس کے بعد بات کو جاری رکھتے ہوئے فریڈ نے کہا:

''میں آپ کو ان خواتین کی نیچر کے بارے میں بھی آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ آپ کی روزانہ کی بنیاد پر چھوٹی چھوٹی چیزیں جو رولز کے خلاف ہوں گی نوٹ کرتی جائیں گی، کسی بھی ایکشن کی صورت میں یہ آپ کو بظاہر چہرے پر مسکراہٹ لا کر بتائیں گی کہ آئندہ کے لیے محتاط رہیں لیکن یہ فائل میں اس بات کو نوٹ کر کے رکھیں گی اور جب کبھی آپ کو اس دفتر سے نکالنے کا فیصلہ ہوا تو ان تمام چھوٹی چھوٹی چیزوں کو آپ کی چارج شیٹ بنا کر آپ کے منہ پر ماریں گی''۔

فریڈ کی اس بات سے میں چونکا کہ کینیڈا میں دفاتر کا ماحول اتنا فرینڈلی نہیں ہے جتنا میں سمجھ رہا تھا۔

مطلب یہ ہوا کہ آپ کی تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کو نوٹ کیا جاتا ہے اور پھر آپ کے خلاف استعمال بھی کیا جاتا ہے۔

فریڈ نے مزید کہا:

''یہ میری فرینڈلی ایڈوائس ہے کیونکہ آپ نے آگے کام کرنا ہے تو ان چیزوں کو

ذہن میں رکھیں کہ آپ کی لمٹ کیا ہیں اور جو کام آپ کو دیا گیا ہے وہی کام آپ کی ذمہ داری ہے اور ہاں میری ان باتوں کا دفتر میں کسی سے ذکر نہیں کرنا''۔

یہ کہہ کر فریڈ نے گفتگو ختم کر دی اور بہانے سے میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔

اس کے بعد فریڈ جب بھی ہفتے میں ایک بار آفس آتا تو اس سے مختصر سی گپ شپ ہو جاتی اور وہ مجھے پوچھ لیتا:

''دفتر میں سب ٹھیک چل رہا ہے اور کوئی خلافِ معمول بات تو نہیں ہوئی؟''

میں اس کو بتاتا کہ اب تک تو ٹھیک ہے۔

میں نے اس کا فون نمبر بھی لے لیا تھا کہ کسی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

دفتر میں ایک دن فریڈ تنظیم کی سی ای او سے بات کر رہا تھا کہ اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے کیونکہ اس نے یونیورسٹی سے بیچلر ڈگری کی ہوئی ہے اور اسے ڈگری کی بنیاد پر اضافی تنخواہ دی جائے۔

فریڈ اپنی یونیورسٹی کی ڈگری اور پاسپورٹ ساتھ لے کر آیا ہوا تھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے اس کو مخاطب کیا:

''آپ کا کام ہو گیا ہے؟''

اس نے کہا:

''ہاں! انہوں نے اس بات سے اتفاق کر لیا ہے اور وہ میری سیلری میں ایک ڈالر 25 سینٹ فی گھنٹہ اضافہ کر دیں گے''۔

''میں نے اس سے پوچھا:

''میں آپ کی یونیورسٹی ڈگری دیکھ سکتا ہوں؟''

اس نے جواب دیا:

''وائی ناٹ''۔

جب میں نے دیکھا تو یونیورسٹی ڈگری میں اس کا نام فرید علی لکھا ہوا تھا۔

اس پر میں بہت حیران ہوا کہ یہ تو مسلمان کا نام ہے۔

میں نے حیران ہو کر اس سے پوچھا:

''آپ کا نام فرید علی ہے؟''

اس نے جواب دیا:

''ہاں''

تو میں نے کہا:

''آپ مسلمان بھی ہوں گے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بتایا:

''یہاں گوروں کو میرا نام لینے میں کبھی کبھار دشواری ہوتی تو انہوں نے مجھے فریڈ نام سے جب مشہور کر دیا تو میں نے بھی اس کو مائنڈ نہیں کیا''۔

فرید علی سے فریڈ کی کہانی کی تفصیل میں جاننا چاہتا تھا لیکن فریڈ کے دفتر آنے پر اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ اس سے تفصیلی بات ہو سکے۔

اتفاق سے دو ہفتے بعد مجھے آفس سے کہا گیا کہ میں فریڈ کے ساتھ جاب شیڈونگ کے لیے کلائنٹ کے گھر جاؤں گا تا کہ وہ مجھے اس کی روٹین کے بارے میں آگاہی اور تربیت دے سکے۔

اگلے دن میں فریڈ کے ساتھ اس کی گاڑی میں چلا گیا۔

ایک گھر میں داخل ہوئے جہاں وہ ہر روز ایک ایسے جزوی طور پر معذور نوجوان کے ساتھ وقت گزارتا تھا جو ایک فوڈ چین پر کام کرتا تھا۔

کلائنٹ جان کی عمر کوئی 35 سال ہوگی اور وہ ذہنی طور پر مکمل فعال نہیں تھا اور اسے سپورٹ کی ضرورت ہوتی تھی۔

جان کئی سال سے فوڈ سٹور پر کام کے لیے جاتا تھا اور فریڈ اس کا سپورٹ ورکر تھا۔

گھر میں داخل ہو کر فریڈ نے میرا تعارف کروایا''۔

یہ ہمارے نئے دوست ہیں۔آپ کو کمپنی دیں گے اور سپورٹ کریں گے''۔

اس پر جان نے مجھے ہیلو اور ویلکم کیا۔

جان صوفے پر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا اور ہم بھی دونوں دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے۔وقفے وقفے سے جان فریڈ سے پوچھ لیتا کہ اس کا کیا حال ہے اور دوبارہ ایسے ہی سوال کرتا۔

فریڈ نے مجھے بتایا:

''یہ صرف فیڈ بیک کے لیے پوچھتا ہے۔دراصل یہ اپنے کام کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو رہا ہے' کیونکہ اس نے خود سے فوڈ سٹور کی سٹاف یونیفارم پہن رکھی تھی''۔

فریڈ کے ساتھ آج مجھے جان کے گھر میں اور پھر اس کے بعد اس کی جاب پر نشست و برخاست کے بارے مجھے جاننا تھا۔اس لیے میں تمام چیزوں کو نوٹ کر رہا تھا جو فریڈ مجھے بتا رہا تھا۔

جیسے ہی 11 بجے فریڈ نے کہا:

''چلو چلتے ہیں''۔

اس سے پہلے فریڈ نے جان سے فرینڈلی انداز میں پوچھا تھا:

''آر یو ریڈی ٹو گو''۔

تو اس نے جواب میں ''یس'' کہا تھا۔

فریڈ نے جان کو اگلی سیٹ پر بٹھایا اور میں پیچھے بیٹھ گیا' کوئی 10 منٹ کی ڈرائیو پر فوڈ سٹور پر جا کر رکے تو جان اتر کر جلدی جلدی سٹور میں داخل ہو گیا۔ہم اس کے پیچھے داخل ہوئے تو اندر بہت سارے لوگ بیٹھے کافی پی رہے تھے۔

جان ان کی ٹیبل پر گیا اور اس نے سب کو ہیلو ہائے کیا اور گڈ مارننگ کہا۔

فریڈ نے مجھے بتایا کہ جان کو کمپیوٹر آپریٹ کرنا نہیں آتا لہٰذا سپورٹ ورکر کے طور

پر اسے سٹور کے کمپیوٹر میں اس کی آمد کا وقت انٹر کرنا ہوتا ہے۔

جب ہم دونوں ایک طرف کرسی میز پر بیٹھ گئے تو فریڈ نے مجھے بتایا:

''جان یہاں صفائی کا کام کرتا ہے اور اس کا کام ٹیبل صاف کرنا اور کوڑے کے ڈرم سے کوڑا نکال کر وہاں نئے پلاسٹک بیگ لگانا ہے' اگر کیچپ ختم ہو جائے تو اس کی فلنگ وغیرہ ہے۔ سٹور نے اسے معذور ہونے کی وجہ سے یہ آسان جاب دی ہے''۔

فریڈ نے مزید بتایا کہ آپ نے جان کی نقل وحرکت پر نظر رکھنی ہوتی ہے' اگر وہ کوئی کام بھول جاتا ہے تو سٹور مینجر براہِ راست اس سے بات نہیں کر سکتا بلکہ وہ ہمارے پاس آئے گا اور کہے گا کہ جان کو کہیں کہ وہ کیچپ فل کر دے۔

جان کو آپ اس بارے میں بتائیں گے کہ وہ یہ کام کرے۔

وہاں ٹیبل پر کچھ عمر رسیدہ مرد وخواتین بیٹھے تھے اور کافی پر گپ شپ کر رہے تھے۔ جان کو ان سب کے نام یاد تھے اور وہ وقفے وقفے سے ان کے پاس جاتا اور پوچھتا:

''ہاؤ آئی ایم ڈوئنگ ٹوڈے؟''

(میں آج کام کیسا کر رہا ہوں) تو وہ سارے انگوٹھا اٹھا کر خوشی سے اس کو بتاتے:

''تم بہت اچھا کام کر رہے ہو''۔

یہ سن کر وہ خوش ہو جاتا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔

ہم دونوں اس کی نقل وحرکت کو نوٹس کر رہے تھے۔ ایک بجے کے قریب فریڈ نے جان کو بتایا کہ تمہارے لنچ کا ٹائم ہو گیا ہے تو وہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔

فرینڈ نے مجھے بتایا کہ جان چونکہ آرڈر نہیں کر سکتا اور رقم بھی گن نہیں سکتا۔ اس لیے اس کے ساتھ کھڑا ہو کر لنچ خریدنا ہوگا۔ فریڈ پیچھے کھڑا تھا کہ کاؤنٹر پر جان نے اپنی مرضی کا آرڈر کیا۔ جس میں برگر اور ڈرنک شامل تھا تو سیل گرل نے اس کے آرڈر پر 50

فیصد سٹاف ڈسکاؤنٹ دیا۔

اس پر فریڈ نے مزید بتایا کہ جان کا سپورٹ ورکر ہونے کی وجہ سے اسے بھی 50 پرسنٹ ڈسکاؤنٹ حاصل ہے۔

جان نے اپنی جیب سے نوٹ نکالا اور سیل گرل کو دینے کے بعد بقایا اور رسید اپنے والٹ میں رکھ لی' پھر فوڈ کی ٹرے اٹھا کر ہم لوگ کاؤنٹر کے پیچھے سٹاف کیبن میں چلے گئے جہاں جان نے گپ شپ کرتے ہوئے ہمارے ساتھ اپنا لنچ ختم کیا۔

یہ ایک 15 منٹ کی بریک تھی اور اس سے پہلے کمپیوٹر میں فریڈ نے لنچ بریک کے لیے ٹائم آؤٹ انٹر کیا تھا اور مجھے بتایا کہ اس طرح لنچ کا ٹائم آؤٹ کرنا ہے۔ جیسے ہی جان نے اپنا فوڈ ختم کیا باہر آ کر فریڈ نے میرے سامنے کا ٹائم ان کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ دوبارہ اپنی جاب پر آ چکا ہے۔

جان دوبارہ سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور ہم دونوں ٹیبل پر بیٹھ گئے۔

فریڈ نے مجھے بتایا:

''یہ جو سامنے بزرگ خواتین و حضرات بیٹھے ہیں' تمام ریٹائرڈ لوگ ہیں اور ان میں سے کچھ کا شتکار بھی ہیں یہ روزانہ یہاں اپنا وقت گزارتے ہیں اور جان انہیں اچھی طرح جانتا ہے۔ اسی لیے بار بار ان سے اپنے بارے میں اچھا فیڈ بیک لینے کے لیے پوچھتا ہے''۔

دوپہر کے بعد میں نے دیکھا کہ سکول کالج کے طلبہ طالبات کا ایک بڑا گروپ فوڈ سٹور میں داخل ہوا تو حیرت انگیز طور پر جان ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

کافی دیر تک جب وہ وہاں کھڑا رہا تو میں نے فریڈ سے پوچھا:

''اس کو کیا ہوا؟''

اس پر فریڈ نے بتایا:

''یہ ہجوم دیکھ کر گھبرا جاتا ہے اور یہ بچے اکٹھے اندر داخل ہوئے ہیں تو یہ کچھ پریشان ہو گیا ہے۔ اس صورتحال میں اس کو بتانا پڑے گا کہ ''ایوری تھنگ از اوکے''۔

یہ لوگ تھوڑی دیر میں چلے جائیں گے۔ فریڈ کے پاس جا کر یہ کہنے پر جان دوبارہ حرکت میں آ گیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

اگلے گھنٹے میں جان کی 4 گھنٹے کی شفٹ ختم ہو گئی اور فریڈ نے مجھے بتایا کہ اب کمپیوٹر میں اس کا ٹائم آف انٹر کرنا ہے' لیکن اس سے پہلے فریڈ نے اس کو بتایا کہ 15 منٹ بعد اس کی شفٹ ختم ہونے والی ہے تو وہ خوش ہو گیا اور جلدی جلدی اس نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔

جان کے ساتھ کام کے لیے فریڈ نے پہلے دن جو معلومات دی تھی وہ بہت دلچسپ تھی اور مجھے ان کو مدنظر رکھنا تھا تا کہ کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اس کے بعد ہم سٹور سے نکلے تو فریڈ نے گاڑی سیدھی جان کے گھر کے دروازے کے پاس جا کر روکی۔ جان کے پاس گھر کی چابی تھی اس نے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔

ہم بھی اس کے پیچھے اندر صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔

جان کے والدین اپنا ایک بزنس چلاتے تھے اور وہ صبح آٹھ بجے گھر سے چلے جاتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ جان کو جاب پر لے جانے کے لیے سپورٹ ورکر ان کی موجودگی میں آ جائے گا۔ اس لیے انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی کہ جان گھر میں اکیلا ہو گا۔ آج صبح جب میں فریڈ کے ساتھ پہنچا تو اس کی ماں سے ہیلو ہائے ہوئی تھی کیونکہ وہ اس وقت روانہ ہونے کے لیے گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔

میں اور فریڈ صوفے پر بیٹھے تھے کہ جان اپنی یونیفارم اتار کر دوسرے کپڑے پہننے کے لیے چلا گیا' کچھ دیر بعد واپس آیا تو ٹی وی پر مزاحیہ شو لگا کر دیکھنے لگا اور پھر وہی گاہے بگاہے پوچھ لیتا ہے کہ آپ کا کیا حال ہے؟ تو اس کو بتانا پڑتا ہے کہ ہم ٹھیک ہیں۔

چار بجے کے قریب فریڈ نے جان کو بتایا:

''ہم جانے کے لیے تیار ہیں''۔

اب کی بار جب اسے گاڑی میں بٹھایا تو وہ سیدھا ایک اور فوڈ سٹور جو کہ اس فوڈ سٹور سے دور نہیں تھا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ اس سٹور کے اندر جا کر'' آئس ٹی ڈرنک'' آرڈر کیا اور رقم ادا کرنے کے بعد رسید اس نے اپنے والٹ میں رکھ لی۔ دوبارہ گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا تو کہنے لگا:

''یہ ڈرنک والی جگہ اس کی سیکرٹ پلیس ہے''۔

آدھے گھنٹے کے فاصلے پر جان کے والدین کا بزنس سٹور تھا۔ فریڈ نے بتایا کہ فائنلی ہمیں جان کو اس کے ماں اور باپ کے پاس اتارنا ہے۔ اس کے بعد ہماری جاب ختم۔ جان کو اس کی ماں کے پاس چھوڑنے ہم دونوں سٹور کے اندر گئے تو جان نے اپنی ماں کو بلند آواز میں ''ہائے مام'' کہا تو اس نے آگے سے اسی طرح پیار محبت سے جواب دیا۔

فریڈ اور میں ان کو ''بائے فار ناؤ'' کہہ کر سٹور سے باہر آ گئے

فریڈ نے مجھے گھر اتارا اور بتایا کہ وہ کل صبح مجھے گھر سے لے لے گا اور دوبارہ جان کے گھر شفٹ کے لیے چلیں گے۔

میں نے فریڈ کا شکریہ ادا کیا اور صبح ملنے کے وعدے کے بعد اپنے گھر داخل ہو گیا۔

اگلی صبح فریڈ نے مجھے گھر سے پک اَپ کیا تو ہم ٹھیک آٹھ بجے جان کے گھر کے باہر پہنچ گئے۔ جہاں اس کی ماں گھر سے روانہ ہو رہی تھی۔ اس سے ہیلو ہائے کے بعد جان نے دروازہ کھول کر ہمیں اندر آنے کو کہا تو ہم دونوں صوفے پر جا کر بیٹھ گئے۔ جہاں پہلے سے ٹی وی پر شو چل رہا تھا جسے جان ہمارے آنے سے پہلے حسبِ معمول دیکھ رہا تھا۔

فریڈ نے مجھے بتایا:

''جان ذہنی طور پر معذور ہونے کے ساتھ بہت حساس شخص ہے اور ان کے دفتر نے جان کے ساتھ کام کرنے کے لیے چند خاتون ورکرز کو یہاں بھیجا

تھا تا کہ اسے کوئی دوسرا کام دیا جا سکے لیکن جان ان کے ساتھ بہتر محسوس نہیں کرتا تھا یعنی کمفرٹیبل نہیں تھا۔اس لیے یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی اور مجھے ہی کئی سال سے اس کے ساتھ کام کرنا پڑ رہا ہے۔آپ چونکہ نئے آئے ہیں اس لیے دفتر آپ کو ٹرائی کرنا چاہ رہا تھا''۔

فریڈ نے پھر اپنی رائے دیتے ہوئے کہا:

''مجھے لگتا ہے کہ جان آپ کی موجودگی میں بہتر محسوس کر رہا ہے۔اس لیے زیادہ امکان یہی ہے کہ آپ کو جان کے ساتھ ذمہ داری دے دی جائے گی''۔

فریڈ نے قدر اطمینان سے کہا:

''چلو آپ کے جان کے ساتھ اٹیچ ہونے کی وجہ سے مجھے بھی کچھ ریلیف ملے گا اور میں کسی اور کلائنٹ کے ساتھ کام کر سکوں گا''۔

میں نے جواب میں فریڈ سے کہا:

''یہ تو آپ کی اپنی اسیسمنٹ ہے۔میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن ظاہر ہے کام ہی کرنا ہے۔دفتر جو فیصلہ کرے گا۔اچھی بات یہ ہے کہ جس طرح آپ بتا رہے ہیں کہ آپ کئی سال سے جان کے ساتھ کام کر رہے تھے اور اب آپ کو چینج چاہیے تو یہ آپ کے لیے بھی بہتر ہوگا''۔

میں نے بھی فریڈ کی دلجوئی کی۔

میری اس ٹریننگ کے بارے میں آج فریڈ نے آفس مینجر کو رپورٹ دینی تھی کہ کلائنٹ میری موجودگی میں کیسا محسوس کر رہا ہے اور وہ کس قدر مطمئن ہے۔

حسب معمول 11 بجے جان کو لے کر ہم فوڈ سٹور پہنچ گئے جہاں جان نے اپنا کام شروع کر دیا۔فریڈ نے مجھے کہا کہ آپ جان کا ٹائم ان کمپیوٹر میں خود ہی ڈال دیں اور میں نے ایسا ہی کیا۔

کیونکہ فریڈ چاہتا تھا کہ میں یہ تمام مراحل آج خود ہی کروں اور اس نے سٹور مینجر کو بھی

میرے بارے بتا دیا کہ جان کے لیے جو بھی ہدایت ہو گی وہ مجھ سے بات کریں گے۔

جان کے لنچ بریک میں مَیں نے ہی اس کی لنچ خریدنے اور پیمنٹ کرنے میں مدد کی' پھر اس کے ساتھ سٹاف کیبن میں بیٹھ کر اس کے کھانے کے ختم ہونے کا انتظار کیا۔ لنچ بریک کا ٹائم کمپیوٹر میں انٹر بھی کر دیا۔ ٹائم ان اینڈ آؤٹ کر دیا تھا۔

جان کے کام کا اگلا گھنٹہ جاری تھا اور ہم دونوں ٹیبل پر بیٹھے تھے کہ میں نے فریڈ سے سوال کیا:

''آپ نے اپنے کینیڈا آنے کے بارے میں ابھی تک نہیں بتایا؟''

کیونکہ فریڈ ریلیکس محسوس کر رہا تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ جان کے ساتھ ڈیوٹی سے اس کی جان چھوٹنے والی ہے۔ اس نے آفس میں اوکے کی رپورٹ دینے کے بعد' میرے سوال پر کہا کہ وہ ویسٹ انڈیز جسے کیریبین بھی کہتے ہیں کے شہر ٹرینڈاڈ میں پیدا ہوا۔ بہت چھوٹا تھا جب 70 کی دہائی میں اس کے والدین کینیڈا آ گئے تھے۔

وہ مسلمان فیملی میں پیدا ہوا اس کے باپ کا نام احمد اور ماں کا نام زیتون تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی کا نام جمیل اور دوسرے کا ریحان تھا۔ ایک بڑی بہن زبیدہ بھی تھی۔ جب وہ کینیڈا میں آئے تو یہ ایک نئی دنیا تھی اور ایک بچے کی حیثیت سے یہاں سکولوں میں جانا ہمیں بہت اچھا لگا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد اور والدہ نے ہمارا خیال رکھنے کی کوشش کی۔ میرے والد پہلے پہل تو کینیڈا آ کر بہت پریشان ہوئے کیونکہ ان کو کوئی کام نہیں مل رہا تھا۔ میری والدہ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود کریبین میں گھریلو خاتون تھیں' لیکن یہاں کے حالات دیکھ کر انہیں بھی ایسا لگا کہ بچوں کو پالنے کے ساتھ ساتھ کوئی ملازمت بھی کرنی پڑے گی' چونکہ موسم بھی شدید سرد تھا اس لیے گھر سے کام پر جانا اور پھر واپس آنا میرے والدین کے لیے بہت مشکل ہوتا تھا' ہمیں سکول میں بھی انہوں نے چھوڑنا بھی ہوتا تھا۔

فریڈ نے بات جاری رکھی:

''وقت بہت تیزی سے گزرتا رہا۔ میرے والد اور والدہ دونوں کام میں لگے رہے۔ والدہ کپڑوں کے بڑے سٹور پر کام کرنے لگی جب کہ والد ایک ریسٹورنٹ میں کام کرتے تھے اور دیر سے گھر لوٹتے تھے۔

ہم چاروں بہن بھائی سکول جاتے اور بڑی بہن ہمارا بہت خیال رکھتی تھی۔ جب بھی والد اور والدہ کو ہم دیکھتے تو وہ تھکے کام سے آتے تھے۔

کچھ عرصہ گزرا ابھی ہم ہائی سکول میں تھے کہ میرے والد نے شہر سے دور ایک چھوٹے قصبے میں ایک ریسٹورنٹ خرید لیا اور ہم لوگ وہاں شفٹ ہو گئے''۔

جب میں نے پوچھا کہ ریسٹورنٹ کس طرح کا تھا اور کیا وہاں شراب وغیرہ بھی فراہم کی جاتی تھی؟ فریڈ نے اس پر بتایا

''مجھے یاد ہے کہ ریسٹورنٹ کے ساتھ چھوٹا سٹور بھی تھا اور پر شراب بھی فروخت ہوتی تھی۔

پہلے پہل تو مسلمان فیملی اور شراب کا کاروبار اچھا نہیں لگتا تھا اور اس بارے اپنے والدین کو بات کرتے بھی سنا مگر لیکن میرے والد کا ذہن کچھ بدل چکا تھا' بعد میں میری والدہ بھی کچھ آزاد خیال ہو گئی تھی۔

اس ریسٹورنٹ پر سٹور کے ساتھ گھر بھی تھا جہاں ہم رہ رہے تھے۔ مقامی سکول سے ہم نے ہائی سکول مکمل کر لیا تھا۔ وہ وقت بھی آ گیا جب کالج و یونیورسٹی جانے کے لیے تیار تھے''۔

فریڈ نے مزید بتایا:

''میں یونیورسٹی چلا گیا اور میں نے پہلے سائیکالوجی میں بیچلر کیا۔ اس کے بعد میں نے سوشل ورک کی ڈگری بھی مکمل کر لی۔ اس دوران سٹور پہ کام بھی کرتا رہا۔

میری بہن زبیدہ نے اپنے ایک کلاس فیلو گورے سے شادی کر لی تو والدین کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوا کیونکہ میرا والد اس خیال کا حامی بن چکا تھا اب ہم کینیڈا میں آئے ہیں تو اس ملک کے ہی رسم و رواج کو اپنائیں گے۔

فریڈ نے بتایا:

''میری بہن ہندوستان میں جا کر مدر ٹریسا کی تنظیم کے لیے کام کرتی رہی' بعد میں اس کی اپنے خاوند سے طلاق ہوگئی اور بچے نہ ہونے کی وجہ سے اس نے خود کو مدر ٹریسا کے ادارے کی رفاعی خدمات کے لیے وقف کر دیا''۔

اس کا ایک بھائی بعد میں جمیل سے جمی بن گیا اور اس نے ایک عیسائی لڑکی سے شادی کر لی اور اس کے بچے بچیاں بھی عیسائی مذہب اختیار کر چکے تھے۔

اس کا سب سے چھوٹا بھائی ریحان وہ رے بن گیا اور اس نے بھی امریکہ میں جا کر ایک افریقی لڑکی سے شادی کر لی اور وہیں کا ہو رہا۔

خود اپنے بارے فریڈ نے بتایا کہ اس نے اپنی ایک کلاس فیلو دوست سے شادی کی لیکن کچھ زیادہ دیر نہیں چل سکی۔ ہم میں میاں بیوی کے طور پر ہم آہنگی نہیں تھی۔

اچھے دوست ہونا کچھ اور ہوتا ہے جبکہ میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے کے تقاضے اور ہوتے ہیں۔ اس لیے مناسب یہی سمجھا کہ علیحدگی اختیار کر لی جائے۔

جب فریڈ سے پوچھا کہ آپ یہ جاب شروع سے ہی کر رہے ہیں تو اس نے بتایا:

''نہیں میں پہلے ٹیچر تھا۔ ٹیچنگ کا کام میں نے چھوڑ دیا کیونکہ یہ مشکل کام تھا۔ کینیڈا کے سکول میں میل ٹیچر کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے آپ کو خواتین ٹیچرز ہی نظر آتی ہیں' بعد ازاں میں نے سیلز کی جاب شروع کر دی اور کچھ سالوں بعد اس میں بھی اسے بوریت محسوس ہونے لگی کیونکہ بہت زیادہ بھاگ دوڑ کرنا پڑتی تھی۔ اس کے بعد اپنے باپ کے پاس رہا جو ریٹائر ہو چکا تھا اور ریٹائرمنٹ ہوم میں تھے''۔

اس نے اپنے باپ کے بارے بتایا کہ وہ ایک چرچ میں رہنے لگا تھا اور آخر میں اس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور اس کی موت ایک پادری کے ہاتھوں میں ہوئی کیونکہ وہ نام کا مسلمان تھا

فریڈ سے جب پوچھا کہ آپ اس وقت مسلمان ہیں یا آپ عیسائی؟ فریڈ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور گویا ہوا:

''ہم ایک اچھی بھلی مسلمان فیملی تھے۔ نمازیں بھی پڑھتے تھے اور خود کو مسلمان گھرانے کے طور پر متعارف کرواتے تھے لیکن کینیڈا آنے کے بعد نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ میں خود، میری بڑی بہن اور میرے دونوں چھوٹے بھائی اپنی اپنی راہ چل دیے۔ میری والدہ کے بھی خیالات کینیڈا میں اس قدر بدلے کہ وہ گوریوں جیسے کپڑے پہننا پسند کرتی تھی۔ میرے باپ نے بھی ریسٹورنٹ کے ساتھ شراب کے کاروبار کو برا سمجھنا بند کر دیا۔ اب ہمارے نام تو مسلمانوں والے ہیں لیکن عملی طور مسلمان نہیں رہے۔

فریڈ نے مزید بتایا:

''میں مقامی مساجد کو کبھی کبھار چندہ بھی دیتا ہوں، باوجود انتہائی کوشش خود کو بطور مسلمان جسٹیفائی نہیں کر سکتا''۔

یہ کہتے ہوئے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ فریڈ اپنی پشیمانی چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

فریڈ نے اپنے باپ احمد کے بارے میں بتایا:

''اس کے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں خیالات کیوں بدلے تھے۔ وہ اکثر ہمیں بتاتے تھے کہ اسلام کو سب سے زیادہ نقصان عربوں نے پہنچایا ہے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ اگر عرب دنیا ٹھیک ہو جائے تو دنیا بھر کے مسلمانوں کی حالت ٹھیک ہو سکتی ہے۔ جس کسمپرسی کا مسلمان دنیا بھر میں

شکار ہیں اس سے نکل سکتے ہیں''۔

ان کے والد کا کہنا تھا:

''عربوں کے پاس بے پناہ دولت اور وسائل موجود ہیں اور وہ مسلمان ملکوں کی مدد کرنے کی بجائے مغربی ملکوں میں شراب خانے، جوا خانے اور ہوٹل خریدنے کا کاروبار کر رہے ہیں۔ وہ عیاشی کی زندگی کو پسند کرتے ہیں۔انہیں اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں کہ دنیا میں مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہا ہے یا جس بھوک و افلاس کا وہ شکار ہیں انہیں اپنے وسائل سے اور اثر و رسوخ سے ان کی مدد کرنی چاہیے''۔

فریڈ نے بات جاری رکھی اور کہا:

''مرتے وقت اس کے باپ کے پاس ایسے بہت سارے سوال تھے جو اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں تھے''۔

''دوست ہمارا ٹائم ختم ہو رہا ہے''۔

یہ کہہ کر فریڈ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا، میرے چہرے کی طرف دیکھا اور میری کمر پر تھپکی دیتے ہوئے بولا:

''گڈ لک مائی فرینڈ'' آپ کینیڈا میں آئے ہو تو اپنی فیملی اور بچوں کا خیال رکھنا۔ ہمارے ساتھ جو ہو چکا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔اس پر مجھے افسوس بھی ہے اور نہیں بھی' لیکن اب وقت گزر چکا اور میری خواہش ہے کہ کینیڈا میں آنے والی فیملیز محفوظ رہیں۔ وہ ہماری طرح اپنا ایمان اور ان کے بچے اپنی شناخت نہ کھو دیں''۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھ سے اپنی ذاتی باتیں شیئر کیں۔

...6

وہ جیسے ہی میری ٹیکسی میں آ کر بیٹھتا' ہمیشہ ایک فون کال کرتا:

''پاپا از آن دے وے''۔

15 منٹ کی مسافت کے بعد جب اس کی منزل آتی تو میں دیکھتا کہ وہ مجھے

''تھینک یو فار دی رائیڈ''۔

کہہ کر خاموشی سے اپنے گھر کے دروازے کی طرف چل دیتا۔

شروع شروع میں تو میں نے نوٹس نہیں کیا لیکن پھر مجھے خیال آیا ''یہ فون کس کو کرتا ہے اور کوئی اس کو دروازے پر ملتا بھی نہیں' نہ ہی کوئی اس کے لیے دروازہ کھولتا ہے۔

اسی تجسس میں مَیں نے ایک دن اس سے پوچھ ہی لیا:

''آپ فون کس کو کرتے ہیں کیونکہ میں نے دروازے پر تو کسی کو دیکھا نہیں''۔

وہ مجھے کہنے لگا:

''میں نے گھر میں ایک کتا اور بلی پال رکھے ہیں۔ میرے علاوہ گھر میں اور انسان نہیں ہے۔ جب میں دفتر سے نکلتا ہوں تو میں ایک کال کرتا ہوں کیونکہ میں نے گھر کے فون پہ ایک سپیکر لگا رکھا ہے جس سے کتا اور بلی میری آواز سنتے ہیں۔ ان کو پہلے سے علم ہوتا ہے کہ میں اب آنے والا ہوں' لیکن میں ان کو کال سے مطلع کرتا ہوں کہ میں راستے میں ہوں''۔

اس نے مزید بتایا:

''میری اس کال کو سپیکر پر سننے کے بعد وہ دونوں دروازے پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جیسے ہی مَیں دروازہ کھولتا ہوں وہ میرا استقبال کرتے ہیں' کوئی

میری ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے تو کوئی آگے پیچھے دوڑتا اور چکر کاٹتا ہے۔ ان کا یہ استقبال دیکھ کر میری ساری تھکن دور ہو جاتی ہے''۔

بات جاری رکھتے ہوئے پھر بولا:

''اس کے بعد میں اپنا بیگ رکھتا ہوں اور کپڑے تبدیل کرتا ہوں۔ کچن میں کچھ کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ یہ ہماری روٹین ہے کہ جب میں کھانا کھاتا ہوں تو وہ میرے ساتھ آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور میں ان کا کھانا بھی ان کے سامنے رکھتا ہوں۔ وہ بھی ساتھ بیٹھ کر کھا رہے ہوتے ہیں۔ بلی ٹیبل پر بیٹھ جاتی ہے جبکہ کتا ساتھ کرسی پر بیٹھ کر کھاتا ہے۔ اس دوران ایسا لگتا ہے کہ ہم گھر کے تمام فرد کھانے کی ٹیبل پر اکٹھے ہیں' نہ صرف کھانا کھا رہے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو محسوس بھی کر رہے ہیں۔ اس دوران میں ٹی وی بھی دیکھتا ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ وہ بھی ٹی وی میں دلچسپی لیتے ہیں۔

کھانا ختم کرنے کے بعد جب میں بستر پر لیٹتا ہوں تو وہ دونوں میرے بستر پر دائیں بائیں لیٹ جاتے ہیں''۔

آج وہ مجھے سب بتانے کے موڈ میں تھا اور کہنے لگا:

''بستر پر لیٹے ہوئے مجھے یہ احساس نیند میں بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ وہ میرے ساتھ بچوں کی طرح لیٹے ہوئے ہیں' کبھی کبھار میں ان سے باتیں بھی کرتا ہوں اور کوئی کہانی سنانے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ مجھے سنتے ہیں اور محسوس بھی کرتے ہیں کیونکہ ہم کئی سال سے اسی طرح سے رہ رہے ہیں۔

وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ وہ خود کو میرے بچے اور میں انہیں اپنے بچوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ میں ساری رات ایک ہی کروٹ لیٹا رہتا ہوں اس خیال سے کہ اگر میں کروٹ لوں گا تو کہیں ان میں سے ایک

میرے نیچے نہ دب جائے۔

میری زندگی اسی کتے اور بلی جو میرے فیملی ممبر ہیں' ان کے ساتھ خوشی سے گزر رہی ہے''۔

یہ کہہ کر اس نے بات ختم کر دی کیونکہ آج بھی وہ اپنے گھر کے سامنے میری گاڑی سے اتر کر جانے لگا تھا۔

ایک دیسی فیملی جو دھائیوں سے کینیڈا میں مقیم تھی' اس نے گھر میں ایک کتا پال رکھا تھا۔

یہ کتا ان کا فیملی ممبر بنا ہوا تھا کیونکہ کئی سال سے گھر میں موجود تھا۔اس کتے کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی فرد گھر آ کر جرابیں اتارتا تو وہ کتا جرابوں سے کھیلنا شروع کر دیتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ گھر والوں کو بعض اوقات جرابیں کونوں کھدروں سے ڈھونڈنا پڑتی تھیں۔

ایک دن گھر والوں نے دیکھا کہ کتا خلاف معمول کوئی حرکت نہیں کر رہا اور سست بیٹھا ہوا ہے۔

اس پر انہیں تشویش ہوئی۔

''یہ کہیں بیمار تو نہیں؟''

بیٹے نے اپنی ماں سے کہا:

''مجھے اس کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے۔آپ مجھے 50 ڈالر دے دیں تاکہ ڈاکٹر کی فیس دی جا سکے''۔

جیسے ہی وہ اینیمل ہاسپٹل گیا تو وہاں انہوں نے کتے کا چیک اَپ کیا۔اسے بتایا گیا کہ اس کا الٹرا ساؤنڈ کیا جائے گا۔دیکھنا پڑے گا کہ کہیں اس کے معدے میں کوئی مسئلہ تو نہیں۔

الٹرا ساؤنڈ میں معلوم ہوا کہ اس کے معدے میں کوئی چیز پڑی ہوئی ہے۔گھر

والوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ کتے نے کوئی جراب نگل لی ہوگی۔

یہ علم ہونے کے بعد اس کے معدے میں جو ڈیپازٹ پڑا ہوا ہے اس کو نکالنے کے لیے آپریشن کرنا پڑے گا۔ جس پر 700 ڈالر خرچ آئے گا۔ بیٹے نے ماں کو فون پر بتایا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔

ان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ کتے کو اینیمل ہاسپٹل سے اس حالت میں گھر نہیں لایا جا سکتا تھا اور نہ ہی ڈاکٹر اس کی اجازت دے سکتے تھے۔

مرتے کیا نہ مرتے۔ کتے کی اس سرجری پر اس قدر رقم خرچ کر کے ہی جان چھوٹی کیونکہ کینیڈا میں کتے اور بلی کا پالنا بچوں کے پالنے سے زیادہ مہنگا پڑتا ہے۔

سٹور پر جاب کے دوران ایک خاتون اور اس کا بیٹا جو بمشکل 10 سال عمر ہوگا اکثر چیزیں خریدنے آیا کرتے تھے۔ ایک دن جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ گھر میں کتنے لوگ ہیں؟ تو اس نے بتایا کہ دو ہیں۔ ''میں اور میرا بیٹا''۔

اسی دوران اس کا بیٹا جلدی سے بول پڑا۔

''ووی آر تھری۔ مطلب ہم تین لوگ ہیں''۔

اس نے ماں کو یاد دلایا کہ آپ ہم ہمارے کتے کو بھول گئی ہیں تو شرمندہ ہو کر کہنے لگی:

''اوہ یس''۔

''ہم تین لوگ ہیں''۔

کینیڈا میں ایک خان صاحب ایک گوری کے گھر دوست کے طور پہ جایا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے کیا دیکھا کہ خاتون گھر کے بیک یارڈ میں بیٹھی ہوئی ہے اور اپنے کتے کے ساتھ آئس کریم کھا رہی ہے۔

جیسے ہی خان صاحب جا کر ساتھ والی کرسی پر بیٹھے دیکھا کہ تو خاتون وہی ایک چمچ آئس کریم کے کپ سے اپنے منہ میں ڈال رہی ہے اور ایک اپنے کتے کے منہ میں۔

کینیڈا میں اکیلی خاتون ہو یا خاندان، کتے اور بلی کو اپنے بچوں کی طرح رکھتے ہیں۔

خان صاحب کو یہ عمل بہت برا لگا اور ان سے نہ رہا گیا تو انہوں نے خاتون سے پوچھا:

''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

اس نے جواب میں پوچھا:

''کیا کر رہی ہوں؟''

خاتون نے لاپرواہی سے کہا:

''اپنے کتے کو آئس کریم ہی تو کھلا رہی ہوں اور وہ مزے لے کر کھا رہا ہے اور خوش ہو رہا ہے جو اس کا حق ہے۔''

خان صاحب دوبارہ گویا ہوئے:

''تمہیں پتہ ہے کتے کے جراثیم خطرناک ہوتے ہیں اور انسان ان سے شدید بیمار بھی ہو سکتا ہے''!

خاتون نے کہا:

''ہاں! مجھے پتہ ہے لیکن میں اپنے کتے کا میڈیکل چیک اَپ کرواتی ہوں اور مجھے نہیں لگتا اس کے جراثیم سے میں بیمار ہوں گی' کیونکہ میں اس سے محبت کرتی ہوں''۔

اس کے بعد خاتون نے ناگواری سے خان صاحب کو کہا:

''دیکھیں آپ نے میرے کتے کے بارے میں اس قدر برا سوچا ہے آپ کی بات سے لگا ہے کہ آپ کتے سے نفرت کرتے ہیں۔ آپ مہربانی کر کے یہاں سے تشریف لے جائیں اور آئندہ میرے گھر نہ آنا کیونکہ مجھے کتا آپ سے زیادہ عزیز ہے''۔

خان صاحب چپ چاپ وہاں سے مزید کچھ کہے سنے نکل گئے۔

ایک فلپائنی خاتون اپنے خاوند جسے سانس کی تنگی کی شکایت کافی دنوں سے تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر کو اپنے اپارٹمنٹ میں لے کر آئی۔

ڈاکٹر نے ہسٹری لینے کے بعد پوچھا:

''آپ کے گھر میں کوئی پالتو جانور کتا یا بلی ہے؟''

خاتون نے ڈاکٹر کو بتایا:

''میں نے چھوٹا کتا پالا ہوا ہے''۔

''کتا کہاں سوتا ہے''؟

ڈاکٹر نے دوبارہ سوال کیا۔

''میں اسے ساتھ بیڈ پر سلاتی ہوں''۔

خاتون نے جواب دیا:

ڈاکٹر نے کچھ دیر توقف کے بعد انہیں بتایا:

''میری اسسمنٹ کے مطابق آپ کے خاوند کو سانس کی تکلیف رات کو اس لیے زیادہ ہوتی ہے کہ اسے ''ڈاگ الرجی'' ہے اور کتا زیادہ قریب نہیں ہونا چاہیئے۔ چونکہ آپ ایک بیڈ شیئر کرتے ہیں اس لیے یا تو کتے کو ساتھ لٹائیں یا خاوند کو''۔

خاتون نے فوراً کہا:

''خاوند دوسرے بیڈ پر سوئے کیونکہ میں کتے کو کسی صورت اپنے سے الگ نہیں سلا سکتی''۔

ڈرائیورز پر ٹیکسی چلاتے ہوئے ایک خاص دباؤ ہوتا ہے' اگر کوئی کسٹمر گھر سے جلدی باہر نہ نکلے تو زیادہ دیر انتظار کرنا انہیں خاصا مشکل لگتا ہے۔

اسی چکر میں صبح کی کال پر جب گھر کے باہر کافی دیر انتظار کرنے کے بعد کوئی مرد یا

خاتون نہیں نکلی۔

ڈرائیور نے ہارن بجا دیا۔ ہارن بجانے کا مطلب یہ تھا کہ میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔ وہ کئی دفعہ ایسا پہلے بھی کر چکا تھا۔ اب کی بار جیسے ہی میں نے ہارن بجایا ایک منٹ بعد گھر کا دروازہ کھلا اور ایک خاتون بھاگتی ہوئی اس کی طرف آئی۔

دیکھا تو پریشان رو رہی تھی، ڈرائیور نے جھٹ سے پوچھا:

''کیا ہوا آپ اس قدر پریشان اور رو کیوں رہی ہیں؟''

اس پر خاتون بولی

''تم نے ابھی ہارن بجا کر بہت غلط کیا ہے۔ میں اپنے کتے کو سلانے کے بعد باہر نکلنے والی تھی کہ تمہارے ہارن کی آواز سے وہ ڈسٹرب ہو گیا ہے۔ اب میں اس قدر پریشان ہوں کہ میں اس حالت میں کتے کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی''۔

پھر اس نے غصے کے انداز میں کہا:

''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اب میں یہ کال کینسل کر رہی ہوں''۔

یوں اس ہارن کے نتیجے میں غیر متوقع پیش آنے والی صورتحال کی وجہ سے ڈرائیور سواری سے محروم ہو گیا اور وقت الگ سے ضائع ہوا۔

کینیڈا کے مغرب میں واقع بڑے شہر وینکور میں ایک ٹیکسی ڈرائیور کے خلاف عدالت میں ایک مسافر نے کیس دائر کر دیا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے کتے سمیت ٹیکسی میں بٹھانے سے انکار کیوں کیا۔

کیس کی سماعت کے دوران جج نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا:

''تم نے مسافر کو کتے سمیت گاڑی میں بٹھانے سے انکار کیوں کیا؟''

ڈرائیور نے بتایا:

''وہ مسلمان ہے اور چونکہ اپنی ٹیکسی میں نماز پڑھتا ہے۔ کتا مسلمانوں کے

لیے نجس جانور ہے اس لیے پاکیزگی کے پیش نظر میں اپنی کار میں کتے کو نہیں بٹھا سکتا''۔

اس پر جج نے کہا:

''ٹیکسی کوئی نماز پڑھنے کی جگہ نہیں ہے''۔

عدالت نے قرار دیا:

''کینیڈا کے قانون میں دیے گئے بنیادی حقوق کے مطابق تم مسافر کو کتے سمیت گاڑی میں بٹھانے سے انکار نہیں کر سکتے تھے لیکن عدالت اس انکار کو قانون سے لاعلمی سمجھتے ہوئے کوئی سزا نہیں تجویز کر رہی' لیکن وارننگ جاری کرتی ہے کہ اس کی طرف سے آئندہ یہ عمل ہرگز نہیں ہونا چاہیے''۔

کینیڈا میں ٹیکسی کے اندر کتے کو گائیڈ ڈاگ کے طور پر بٹھانا اس لیے لازم ہوتا ہے کہ کوئی نابینا شخص ٹیکسی کی سہولت سے محروم نہ رہے۔ گائیڈ ڈوگ جو نابینا خواتین و حضرات کی نقل وحرکت میں مدد کرتے ہیں۔ ان کے تربیت یافتہ ساتھی ہوتے ہیں۔ ان کتوں کی یونیورسٹی میں باقاعدہ تربیت کے بعد گریجویشن ہوتی ہے۔ گائیڈ ڈاگ کی قیمت ایک اندازے کے مطابق 60 ہزار ڈالر تک بھی ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کینیڈا کے مختلف شہروں میں ٹیکسی سروس میں اگر کوئی مسافر بلی لے کر بیٹھتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ بلی کو مخصوص باکس کے اندر رکھا گیا ہو۔ اس طرح کتا بھی حفاظت سے پچھلے حصے میں بٹھایا گیا ہو۔

مختلف ٹیکسی کمپنیز اپنے ڈرائیور کو یہ سہولت فراہم کرتی ہیں کہ وہ اگر کتے یا بلی سے خوفزدہ ہیں یا پسند نہیں کرتے تو وہ کمپنی کو پہلے سے بتا سکتے ہیں کہ انہیں کوئی ایسی کال ڈسپیچ نہ کی جائے جس میں مسافر کے پاس کتا یا بلی موجود ہو۔

اس کے باوجود کئی مسافر کال کرتے ہوئے کمپنی کو اپنے ساتھ لے جانے والے کتے اور بلی کے بارے میں نہیں بتاتے۔ جس کی وجہ سے بعض ڈرائیور انہیں

بٹھانے سے انکار کر دیتے ہیں اور اس کے بعد کمپنی کو مسافر کے لیے دوسری گاڑی بھیجنا پڑتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کینیڈا میں جن لوگوں نے بلی اور کتا پال رکھا ہوتا ہے وہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی ان کے ان پالتو جانوروں کو بری نظر سے دیکھے یا نظر انداز کرے۔

کینیڈا میں ہیومین سوسائٹی کے نام سے کتے اور بلیوں کے لیے سینٹرز قائم کیے گئے ہیں۔ جہاں لاوارث یا گمشدہ کتے اور بلی کو رکھا جاتا ہے اور ان کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ اس سینٹر پر یہ سہولت ہوتی ہے خواہش مند کتا یا بلی گود لے سکتے ہیں۔ سینٹر کا عملہ اس سلسلے میں مدد کرتا ہے۔ اس کے لیے کچھ ادائیگی کرنا پڑتی ہے۔ ایک کینیڈین خاتون نے اپنے گھر میں پالتو بلے کے بارے میں بتایا کہ وہ ہیومن سوسائٹی جا کر کوئی بلی یا بلا گود لینا چاہتی تھی۔ جب وہ وہاں گئی تو شروع میں اس کی طرف مسلسل گھور کر دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو وہ اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی اور مختلف بلیوں کو غور سے دیکھتی رہی لیکن اسے کوئی پسند نہیں ائی۔ جب واپس آئی تو وہی بلا اس کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسی کو ہی گود لے لیتی ہوں۔

جب وہ بلے کو گھر لے کر آئی تو وہ پہلے دن ہی گھر سے مانوس ہو گیا اور اس نے اسے ہرگز تنگ نہیں کیا۔

خاتون نے خوشی سے بتایا کہ وہی بلا باہر سے گھر آنے پر اس کے لیے اندر سے دروازے کی کنڈی کھول دیتا ہے۔ وہ میری آہٹ کے ساتھ ہی دروازہ کھول دیتا ہے۔ ابھی میں چابی نہیں لگاتی کہ اپنے پاؤں پر بمشکل کھڑا ہو کر اندر سے کنڈی کھولنے میں مہارت حاصل کر چکا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کینیڈا میں کتے اور بلی کو گھر میں رکھنے کے لیے سٹی گورنمنٹ کے ساتھ رجسٹر کروانا اور اس کی انشورنس لینا لازمی ہوتا ہے۔

کتے اور بلی کے لیے فیملی ڈاکٹر بھی ہوتے ہیں جن کے ہاں ان کی باقاعدہ

فائل بنی ہوتی ہے۔جس میں ان کی ویکسینیشن اور علاج معالجے کی ہسٹری درج ہوتی ہے۔

بہت سے کینیڈین خواتین وحضرات اپنے کتے اور بلی کے دانتوں کی سالانہ صفائی کے لیے اینیمل ہاسپٹل میں لے کر جاتے ہیں۔جہاں ان سے اچھی خاصی فیس وصول کی جاتی ہے۔جو کم از کم تین سو ڈالرز یا اس سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔

شہر کے ہر حصے میں ''ڈوگ پارک'' بھی بنائے جاتے ہیں جہاں پر دن کے کسی وقت بھی کتوں کے مالکان ان کو گھمانے لے جاتے ہیں۔پارک میں وہ دیگر کتوں کے ساتھ کھیلتے اور گھومتے ہیں' لیکن شاز و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس پارک میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی ہوں۔

اس کے علاوہ کتوں اور بلیوں کے لیے ڈے کیئر سینٹر بھی بنے ہوئے ہیں۔جن لوگوں کے بچے نہیں ہوتے اور گھر میں ان پالتو جانوروں کو دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا تو دفتر جانے سے پہلے ان کو مخصوص ڈے کیئر سنٹر میں چھوڑ جاتے ہیں۔جہاں ان کے لیے کھانے اور سونے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔واپسی پر وہی خواتین وحضرات اپنے کتے یا بلی کو گاڑی میں گھر لے جاتے ہیں۔

...7

دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح کینیڈا میں بھی غربت یہاں کے مکینوں کی زندگی کے ساتھ کسی نہ کسی انداز سے جڑی ہوئی ہے۔

لاکھوں کی تعداد میں ایسے افراد اور گھرانے ہیں جن کی روٹی بمشکل پوری ہوتی ہے باقی آسائشوں اور سہولتوں کا حصول تو دور کی بات ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کینیڈا کی حکومت ایسے گھرانے جہاں پر کوئی کام نہ بھی کرتا ہو تو بچوں کے لیے سرکاری امداد جسے چائلڈ بینیفٹ کہتے ہیں دیتی ہے اور وہ اسی سے گھر کا نظام چلا لیتے ہیں۔ جیسے ہی بینیفٹ کی رقم مہینے کے تیسرے ہفتے میں ان گھرانوں کے اکاؤنٹ میں آتی ہے یا اس کا چیک ڈاک میں ملتا ہے تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے' فوراً سٹورز کا رخ کرتے ہیں جہاں ان جیسے خریداروں کی بھیڑ لگی ہوتی ہے۔ اتفاق دیکھیے کہ چند ہزار ڈالر کی رقم دو تین دن میں وہ اڑا دیتے ہیں کیونکہ ان کے ہاں بچت کا تصور نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

سٹور میں کام کے دوران ایک افریقی النسل نوجوان بس کے انتظار میں وقت گزارنے کے لیے ہر صبح سٹور میں چکر لگایا کرتا تھا' آخر میں کبھی کبھار ایک چھوٹی چاکلیٹ خرید لیتا تھا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھ لیا:

''آپ الصبح کدھر جاتے ہو؟''

اس نے بتایا:

''میں بس میں کام پر جاتا ہوں''۔

مجھے حیرت ہوئی اور میں نے اس سے پوچھا:

''تم گاڑی کیوں نہیں خرید لیتے تا کہ تمہیں کام پر جانے میں کوئی دقت نہ ہو''۔

اس نے بتایا کہ وہ گاڑی خریدنے کی مالی سکت نہیں رکھتا' پھر میں نے کہا:

''تم سائیکل ہی خرید لو''۔

اس نے جواب میں کہا کہ سائیکل خریدنے کی میرے پاس رقم نہیں ہے۔

میں نے اس سے پوچھا:

''تمہیں کتنی دیر ہوگئی کینیڈا میں آئے ہوئے''۔

کہنے لگا کہ میں تو پیدا ہی یہاں ہوا تھا۔

یہ سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہاں پیدا ہونے والے نوجوان کی یہ حالت ہے کہ اس کی سائیکل خریدنے کی بھی استطاعت نہیں ہے اور وہ ہر روز مزدوری کے لیے جاتا ہے بس پر۔

اس طرح کے افراد جو دیہاڑی دار مزدور ہوتے ہیں یا بیمار ہوتے ہیں اگر ان کے بچے بھی ہوں تو حکومت کینیڈا سے جو بینیفٹ کی رقم آتی ہے تو وہ اپنی عادت کے مطابق چند دنوں میں خرچ کر دیتے ہیں۔اس دوران انہیں یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ ان کا کھانا پینا کیسے چلے گا ؟ان حالات میں ہر شہر میں کچھ رفاعی تنظیمیں کام کر رہی ہوتی ہیں جو غریب اور نادار لوگوں کے لیے لنگر خانے چلاتی ہیں۔ جہاں انہیں صبح کا ناشتہ اور شام کو کھانا بھی دیا جاتا ہے۔ایسے سینٹرز پر بے گھر افراد اور پورے خاندان کے لوگ جا کر کھانا کھاتے ہیں۔اچھی بات یہ ہے کہ ان لنگر خانوں کی عمارات میں کسی بھی مرد و خواتین یا بچے کو انکار نہیں کیا جاتا۔ جو بیمار اور نشے کے عادی افراد ہوتے ہیں ان کو اندر میز کرسیوں پر بٹھا کر کھانا کھلانے کی بجائے باہر ہی تھما دیا جاتا ہے تا کہ ان کی حالت کی وجہ سے دوسرے لوگوں کو مسئلہ نہ ہو۔ایک بار ایسے لنگر خانے کی عمارت میں موجود سیکورٹی گارڈ سے پوچھا کہ کتنے لوگوں کا کھانا یا ناشتہ یہاں تیار ہوتا ہے؟

معلوم ہوا کہ 200 سے زائد لوگوں کے لیے فوڈ تیار کی جاتی ہے۔اس کے لیے شہر

کے متمول اور مالدار لوگوں کے علاوہ عام لوگ بھی حکومت کے ساتھ مدد کرتے ہیں تا کہ ایسے لوگوں کو کھانا مل سکے۔ ہارویسٹ نام سے ایک بہت بڑا فوڈ بینک ہے جہاں پر مختلف سٹورز کی بچ جانے والی خوراک سٹاک کر لی جاتی ہے' پھر اس کو علیحدہ علیحدہ کر کے نادار اور ضرورت مند گھرانوں کو دینے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے چرچ اور تعلیمی اداروں کی عمارات میں ڈسٹری بیوشن ماہانہ طور پر کی جاتی ہے۔ اس فوڈ بینک سے خوراک حاصل کرنے کے لیے خاندانوں کو رجسٹر کروانا پڑتا ہے۔ اسی حساب سے خوراک کے پیکج بنا کر تقسیم کیے جاتے ہیں۔

بے شمار لوگ اس فوڈ بینک میں رضا کارانہ طور پر کام کرتے ہیں اور فوڈ بینک انہیں کھانا کھانے کی آفر بھی کرتا ہے' کچھ لوگ کھا لیتے ہیں اور کچھ لوگ یہ پسند نہیں کرتے۔ ہمارے علاقے کے ایک سکول میں جہاں میں ان دنوں انٹرن شپ کر رہا تھا وہاں فوڈ بینک کی بھیجی ہوئی گراسری، پھل اور دیگر چیزیں لائی گئی تھیں۔ مجھے بطور رضا کار اس فوڈ کو رجسٹرڈ لوگوں میں تقسیم کرنے کے لیے مختلف ڈبوں میں ایک جیسا پیک کرنا تھا۔ رجسٹرڈ لوگوں کو پانچ بجے کا ٹائم دیا گیا تھا لیکن ہم نے اس سے پہلے ہر ایک کے لیے ڈبے تیار کر کے رکھے ہوئے تھے تا کہ وہ لوگ جیسے ہی آئیں اپنا ایک ڈبہ اٹھائیں اور چلے جائیں۔

یہ سب کچھ ہم ایک خاتون سپروائزر کی نگرانی میں کر رہے تھے۔ ہر ڈبے میں دو دو ڈبل روٹی ڈالنے کے بعد کچھ دیگر چیزیں بھی بچ گئی تھیں جو الگ سے ایک ٹیبل پر رکھ دی گئی کہ اگر کسی کو چاہیے ہو گا تو وہ اٹھا لے گا۔

پانچ بجے رجسٹرڈ لوگوں کی آمد شروع ہو گئی۔ لوگ اپنی اپنی گراسری ٹرالی لے کر آئے تھے' کچھ لوگوں کے پاس بیگ تھے جن میں انہوں نے ڈبوں سے اپنے لیے گراسری کی چیزیں نکالیں اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو الگ ٹیبل پر پڑی ڈبل روٹی بھی اٹھا رہے تھے شاید انہیں اس کی زیادہ ضرورت تھی۔

اس دوران کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے ایک جاننے والے پاکستانی جو ہماری ہی بلڈنگ میں رہتے تھے۔ باریش بزرگ آدمی چلے آ رہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ یہ حضرت اپنی مالی حیثیت کی وجہ سے اس مفت خوراک کے ہرگز مستحق نہیں تھے۔ کمال یہ تھا کہ وہ خود کو اس فوڈ کے لیے رجسٹر کروا کر آج گراسری لینے پہنچے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو آتا دیکھ کر کوارڈینیٹر کو بتایا کہ میں واش روم جا رہا ہوں لیکن اس سے پہلے میں ان صاحب کو دیکھ چکا تھا اور وہ اپنے ڈبے سے فوڈ لینے کے بعد میز پر پڑی فالتو ڈبل روٹیاں بھی اٹھا کر اپنے بیگ میں ڈال رہے تھے۔ اتفاق ایسا تھا کہ انہوں نے مجھے پہچانا نہیں اور نہ ہی میری طرف توجہ کی۔ ان کا زیادہ دھیان زیادہ سے زیادہ چیزیں اٹھانے پر تھا۔

وہ ابھی نکل کر گئے ہی تھے کہ ایک پاکستانی خاتون جو ہماری ساتھ والی بلڈنگ میں رہتی تھی چلی آ رہی ہیں۔ ان خاتون کو بھی میں نے اپنے محلے میں دیکھ رکھا تھا بلکہ ان کی ایک بیٹی اسی سکول میں میرے بیٹے کی کلاس میں پڑھتی تھی۔ مجھے دیکھ کر خاتون نے کچھ دیر کے لیے نوٹس کیا لیکن اس نے اپنے ڈبے سے تمام چیزیں اٹھا کر اپنی باسکٹ میں رکھیں اور پھر فالتو چیزوں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

میں وہاں موجود یہ سب دیکھ رہا تھا تو انہوں نے نظریں چرا کر میری طرف دیکھا تو میں نے یوں ری ایکٹ کیا جیسے میں ان کو دیکھ نہیں رہا۔

اس کے بعد خاتون سے رہا نہیں گیا اور اس نے فوڈ ڈسٹری بیوشن کی کوارڈینیٹر گوری کے پاس جا کر پوچھ ہی لیا میرے بارے میں کہ یہ کون ہے؟

اس پر بروک نے اسے بتایا کہ یہ آج پروگرام کے والنٹیئر میں سے ہے۔ خاتون نے اس جواب کے بعد جلدی جلدی اپنا سامان اٹھایا اور باہر کی طرف چل دی۔

ابھی ایک دو ڈبے باقی تھے کیونکہ کچھ لوگ ابھی تک پہنچے نہیں تھے تو ان کا ہمیں انتظار کرنا تھا۔ پاکستانی خاتون کے بروک سے سوال کے بعد مجھے بھی تجسس ہوا کہ یہ کیا

پوچھ رہی تھی؟

میرے دریافت کرنے پر بروک نے بتایا کہ وہ آپ کا پوچھ رہی تھی کہ یہ یہاں کیوں ہے تو میں نے اس کو بتا دیا یہ ہمارا والنٹیئر ہے۔

میں نے بروک سے ایک اور سوال کیا کہ اس پروگرام کے تحت خوراک کے حصول کے لیے جو افراد یا گھرانے خود کو رجسٹر کرواتے ہیں ان کی کوئی انکوائری بھی کی جاتی ہے کہ وہ اس کے مستحق بھی ہیں یا نہیں؟

اس پر بروک بولی۔ مجھے علم ہے کہ تم یہ بات کس لیے پوچھ رہے ہو؟ لیکن یہاں یہ اصول ہے کہ جس بندے یا گھرانے نے اس خوراک کے حصول کے لیے درخواست دے دی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کا مستحق ہے۔ اس کی انکوائری کرنے کی کوشش کرتے ہیں نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کیونکہ فوڈ بینک نے تو یہ خوراک عام لوگوں تک پہنچانی ہوتی ہے۔

تھوڑی دیر میں باقی دو ڈبوں کے دعوے دار بھی پہنچ گئے اور یوں آج کے دن ہماری غرباء و مساکین میں خوراک کی تقسیم کا عمل مکمل ہو گیا۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا اور کوارڈینیٹر نے میرے سمیت دیگر تمام رضا کاروں کا شکریہ ادا کیا۔

ہارویسٹ ایسے بڑے فوڈ بینک کے ذریعے ایک لاکھ سے زائد گھرانوں جن میں بزرگ، عورتیں بچے اور مرد شامل ہیں' ان میں ماہانہ مفت خوراک تقسیم کی جاتی ہے۔

اس فوڈ بینک کے ذریعے مقامی سکولز میں ایک پروگرام بھی شروع کیا گیا تھا کہ بچوں کو صبح کا ناشتہ دیا جائے' کیونکہ بے شمار بچے صبح گھر سے ناشتہ کیے بغیر سکول آتے تھے۔

ایسے بچوں کے گھر سے ناشتہ کیے بغیر سکول آنے کی بڑی وجہ ان کے والدین تھے۔ جو یا تو اصبح کام کے لیے نکل جاتے اور ناشتے کے لیے بچوں کی نگرانی نہیں کر سکتے تھے' یا پھر ایسے نادار گھرانے جہاں اتنے وسائل نہیں تھے کہ صبح بچوں کو ڈھنگ کا ناشتہ دیا

جا سکے' کچھ بچے ایسے بھی تھے جن کے والدین کسی نشے کی وجہ سے سکول ٹائم کے وقت سو رہے ہوتے تھے اور اٹھ کر ان کو ناشتہ نہیں دے پاتے تھے۔ اس بارے میں ایک سروے کیا گیا اور فوڈ بینک نے فیصلہ کیا کہ کوئی بچہ بھی ناشتے کے بغیر سکول نہ آئے یا محروم نہ رہے۔ یہ پروگرام جس کو مقامی حکومت کی فنڈنگ سے کامیابی سے چلایا گیا۔ اس کے لیے بچے کو گھر سے ناشتہ پروگرام میں شامل ہونے کے لیے ایک فارم والدین سے دستخط کروا کے جمع کروانا ہوتا تھا۔

...8

پولینڈ میں کیک سٹور پر پولیس بلا لی گئی اور ہمارے گروپ کے جو لوگ سٹور میں تھے ان کو پولیس نے روک لیا اور پاسپورٹ طلب کرنے شروع کر دیے۔ اس اچانک کارروائی پر سب حیران و پریشان تھے۔ حاجی صاحب نے بھی پریشانی کے عالم میں میرے قریب آ کر کہا:

''حافظ صاحب کچھ کلمہ کلام پڑھیں' لگتا ہے کام کوئی زیادہ ہی خراب ہو گیا ہے''۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ پولیس کو انگلش نہیں آتی تھی اور وہ پولش بولتے تھے اور حاجی صاحب کو پولش کی سمجھ نہیں آتی تھی' لہٰذا وہ صرف پاسہ پورٹ، پاسہ پورٹ کہہ کر ہم سے پاسپورٹ طلب کر رہے تھے۔

حاجی صاحب کے کہنے پر میں نے آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا اور مسلسل منہ میں پڑھتا چلا گیا تا کہ پولیس کو یہ بھی شک نہ پڑے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں' کچھ دیر میں پولیس کے ایک ایسے آفیسر آئے جو تھوڑی بہت انگلش جانتے تھے۔ ان سے حاجی صاحب نے معاملے کی نوعیت پوچھی:

''ہم لوگوں نے ایسا کیا کیا ہے جو پولیس اس قدر حرکت میں آئی ہوئی ہے؟''

اس پر پولیس آفیسر نے بتایا:

''دراصل سٹور کی سیلز گرل نے آپ کے ساتھی کے بارے میں شکایت کی ہے کہ اس شخص کی آنکھوں میں کشش کی وجہ سے وہ ہپناٹائز ہو گئی ہے''۔

پھر پولیس آفیسر نے اطمینان سے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا:

''لیکن ہمیں کچھ اس طرح کی کوئی بات نظر نہیں آئی اور نہ ہی سٹور پر کوئی

نقصان ہوا ہے''۔

حاجی صاحب نے جب پولیس آفیسر کے منہ سے سنا تو ان کی جان میں جان آئی۔ میں نے دیکھا ان کے چہرے سے پریشانی کے آثار جاتے رہے۔ وہ جو معاملہ سمجھ رہے تھے وہ نہیں تھا۔ وہ معاملہ کیا تھا اس کا ذکر آگے چل کر کروں گا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ 70ء کی دہائی کی بات ہے۔ سمن آباد لاہور میں ایک مدرسے میں قرآن حفظ کر رہا تھا تو میرا وہاں دل نہیں لگتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے درس میں مقیم بیرون لاہور کے طلبا کے ساتھ کھانے پینے کے معاملے میں پیش پیش ہوتا تھا۔ ہر شام محلے کے گھروں سے کھانا اکٹھا کر کے لانے میں زیادہ دلچسپی تھی۔

میری والدہ کی خواہش تھی کہ میں حافظ قرآن بنوں جبکہ میں نیم دلی سے حفظ کر رہا تھا۔ میرے استاد بھی میری کارکردگی سے زیادہ خوش نہیں تھے لیکن مدرسے سے باہر کھانا اکٹھا کرنے کے معاملے میں وہ میری تعریف کیا کرتے تھے' کیونکہ میں جس گھر میں بھی جاتا وہاں خواتین عزت سے بلانے پر مجھے اچھا اور زیادہ کھانا دیتی تھیں۔ اس خدمت سے مدرسے میں طالب علم بھی مجھ سے راضی تھے۔

میری والدہ نے جب دیکھا کہ میں حفظ میں توقع کے مطابق دلچسپی نہیں لے رہا تو انہوں نے ہمارے ایک رشتہ دار سے بات کی

''اسے کیوں نہ بیرونِ ملک بھیج دیا جائے جو میری خواہش بھی تھی''۔

میرا ایک بڑا بھائی پہلے ہی برطانیہ میں تھا اور وہ والدہ کو رقم بھیجا کرتا تھا۔ بھائی نے شہریت کے لیے برطانیہ ہی میں شادی کر لی تھی اور اسے پاکستان آنے میں بڑی مشکل کے وقت ملتا تھا۔

ہمارے اس رشتہ دار نے جو میری والدہ کو خالہ جی کہہ کر بلاتا تھا۔ میری والدہ کو بتایا:

''برطانیہ سے ایک برٹش پاسپورٹ ہولڈر حاجی صاحب لاہور آئے ہوئے

ہیں۔ وہ یہاں سے کچھ لوگوں کا گروپ یورپ لے کر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کام کے لیے وہ ایک لاکھ روپے لیں گے اور آپ کے بیٹے حمید کو یورپ پہنچا دیں گے گارنٹی کے ساتھ''۔

میری والدہ نے مجھے بلا کر کہا:

''تو جلدی سے اپنا پاسپورٹ بنوا لے اور میں تیرے بھائی کو فون پر کہتی ہوں کہ وہ ایک لاکھ روپے بھیج دے تاکہ تو باہر چلا جائے''۔

والدہ مجھے تاکید کرتے ہوئے بولیں

''تیرے حق میں یہی بہتر ہے کیونکہ تم یہاں حفظ کر رہے ہو اور نہ کسی کام میں تمہارا دل لگتا ہے۔

ایک بیٹا تو پہلے ہی برطانیہ میں ہے اور تو بھی یورپ چلا جائے گا تو تم دونوں کی زندگی بہتر اور آسان ہو جائے گی۔ میرا کیا ہے، میں اسی حال میں گزارا کر لوں گی تمہاری بہنیں یہاں ہیں وہ میرا خیال رکھیں گی''۔

والدہ موقعہ کو غنیمت جان کر مجھے سمجھانے کے لیے بولتی چلی گئی۔

ایک ہفتے بعد میرا پاسپورٹ بھی بن کر آ گیا کیونکہ ہمارے رشتہ دار رشید نے ساتھ جا کر دفتر میں مدد کی تھی۔ میں نے پاسپورٹ آفس زندگی میں دیکھا ہی نہیں تھا۔

بھائی نے برطانیہ سے رقم بھی بھیج دی۔ ہمارا رشتہ دار رشید دراصل اعتبار کا بندہ تھا اور برٹش نیشنل حاجی صاحب کا ایجنٹ تھا کیونکہ وہ اس کے گروپ کے لیے ایسے بندے ڈھونڈ کر دے رہا تھا جو اتنی بڑی رقم دینے کی سکت رکھتے ہوں۔ ظاہر ہے وہ اس میں سے اپنا حصہ بھی لے رہا ہوگا۔

رشید والدہ کے پاس آیا۔ میرا پاسپورٹ اور رقم لے کر کر چلا گیا۔ دو دن بعد دوبارہ آیا اور پیغام دیا:

''ایک ہفتے میں ویزے وغیرہ کا کام مکمل ہو جائے گا اور اس کے بعد گروپ

یورپ کے لیے بذریعہ وین روانہ ہوگا جس میں 6 لوگ ہوں گے''۔

میں دل میں بڑا خوش تھا اور سوچ رہا تھا:

''میں مدرسے اور لاہور کے ماحول سے نکل کر یورپ کی فضاؤں میں عیش کروں گا''۔

ٹھیک ایک ہفتہ کی تیاری کے بعد جس دن مجھے روانہ ہونا تھا تو میرا دل بجھا ہوا تھا۔

اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ اپنے گھر اور ماں سے جدا ہونا کتنا مشکل کام ہے؟

کبھی میرا دل کرتا کہ میں منع کر دوں کیونکہ مجھے ماں کے چہرے پر بھی اداسی اور غم دکھائی دے رہا تھا جسے وہ ظاہر نہیں کر رہی تھی۔

زبان سے مائیں بھلے جو مرضی کہیں لیکن دل سے وہ کبھی اپنی اولاد کو جدا نہیں کرنا چاہتیں۔

اگر کوئی ایسا کرے تو یقیناً دل پر پتھر رکھ کر اور خود کو یہ سمجھا کر ہی کرتی ہیں کہ وہ اس جدائی کو برداشت کر لیں گی لیکن ان کی اولاد کا بھلا ہو جائے گا۔

میرا دل کرتا کہ میں والدہ کے پاس بیٹھ جاؤں اور ان کی گود میں سر رکھ کر اپنا دکھ بتا کر رونا چاہتا تھا۔''میں نے ان سے باہر جانے کی خواہش کا اظہار کیوں کیا''۔

آج مجھے حقیقتاً اندازہ ہو رہا ہے تھا کہ یہ کتنا بڑا مشکل کام ہے۔

ماں خاموش بیٹھی تھی' صرف میرے سر پہ ہاتھ پھیر رہی تھی اور میں نے دیکھا کہ میرے چہرے پر اس کے آنسو گر رہے ہیں۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر ماں کو گلے لگا لیا اور کہا:

''ماں جی مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کو بہت ستایا ہے۔آپ کی بہت باتیں نہیں مانیں اور نافرمانی کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گی۔

اگر ایسا نہ ہوا تو میں یہ شاید سفر کرنے کے قابل ہی نہ رہوں۔آپ سے اس

طرح جدائی کا پچھتاوا زندگی بھر رہے گا''۔

میں یہ کہہ کر ماں کے پاؤں پکڑ لیے۔

ماں نے میرے ماتھے پر بوسہ دیا اور کہا:

''جاؤ بیٹا ماں کو دل بڑا کرنا پڑتا ہے اللہ نے ماؤں کو بڑے دل اس لیے ہی دیے ہوتے ہیں۔ اولاد اس دل کے اندر ہی بستی ہے۔ تم جہاں بھی ہو گے میرے دل میں رہو گے۔ میری دعائیں ہمیشہ تیرے ساتھ رہیں گی۔ میں تمہیں دعاؤں کے ساتھ یاد کروں گی کہ اللہ تجھے کامیاب کرے''۔

والدہ نے چارپائی سے اٹھ کر مجھے بھرپور حوصلہ دیا۔

میں نے اپنا بیگ جس میں میرا ضروری سامان اور کچھ پہننے کے کپڑے تھے اٹھایا اور گھر کے در و دیوار پر آخری نظر ڈالتے ہوئے دروازے سے سر جھکائے باہر نکل آیا۔ پیچھے سے پھر ماں کی آواز آئی:

''جاؤ بیٹا تم اللہ کی حفاظت میں رہو گے''۔

میں واپس مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ شاید وہاں کے چہرے کو دیکھ کر میں جذبات پر قابو نہ رکھ سکوں۔

میں نے دل کڑا کیا اور سر کے اوپر سے پیچھے کی طرف ہاتھ ہلایا تا کہ میری ماں کو پتہ چل جائے کہ میں نے اس کی دعا سن لی ہے۔

رشید کے ساتھ رکشے میں بیٹھا اور وہ مجھے شادمان میں ایک بڑے گھر میں لے گیا جہاں ایک چمکتی وین کھڑی تھی جس پر برطانیہ کی نمبر پلیٹ لگی تھی۔

میں خوش تھا کہ اس وین میں سفر کرنے کا موقع ملے گا۔ رشید مجھے ایک کمرے میں بٹھا کر چلا گیا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ تین آدمی جنہوں نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی اندر آئے اور سلام کر کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔

مجھے لگتا تھا کہ یہ بھی گروپ میں جانے والے ہیں۔ شکل وصورت سے پڑھے لکھے

اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتے تھے۔ میں ہی ان میں نوعمر تھا۔ دروازہ کھلا تو رشید کے ساتھ دو آدمی اور اندر داخل ہوئے اور میرے ساتھ دائیں بائیں براجمان ہو گئے۔

رشید ہمیں کہنے لگا:

''حاجی صاحب بس آتے ہیں تھوڑی دیر میں''۔

اتنی دیر میں کمرے میں لمبے قد کے ایک شخص کی آمد ہوئی جس نے سر پر حاجیوں والا رومال پہنا ہوا تھا اور چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے سائز کی تسبیح بھی تھی۔ انہوں نے آتے ہی سب کو سلام کیا سب سے ہاتھ ملایا۔

مسکراہٹ کے ساتھ حال احوال پوچھا اور سامنے صوفے پر بیٹھ گئے اور بتانے لگے:

''آپ لوگ ہمارے گروپ کا حصہ ہو اور ہم یورپ جا رہے ہیں سیر کے لیے''۔

وہ یہ بات کر ہی رہے تھے کہ ایک اور مولانا اندر تشریف لائے۔ جنہوں نے جبہ پہنا ہوا تھا۔ سر پر کڑھائی والی ٹوپی تھی۔ جب سے ہی وہ اندر آئے تو حاجی صاحب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے:

''مرشد صاحب تشریف لائیے، خوش آمدید''۔

انہیں ساتھ والی نشست پر بیٹھنے کا کہتے ہوئے جھک گئے۔ حاجی صاحب نے اپنے مرشد کا تعارف سب سے کروایا اور پھر انہوں نے ان سے درخواست کی:

''آپ دعا فرمائیں ہمارا یہ سفر خیریت سے گزرے اور ہم منزل مقصود پر پہنچنے میں کامیاب و کامران ہوں''۔

مرشد نے با آواز بلند دعا کروائی اور سب کے لیے خیر و برکت اور صحت، تندرستی اور منزل کی آسانی کے لیے متعدد قرآنی دعائیں پڑھیں۔ سب کو مبارک باد دی کہ آپ لوگ حاجی صاحب کے ساتھ سفر کریں گے۔

اس کے بعد سب کو کھانا کھلایا گیا اور چائے پینے کے بعد باہر وین میں بیٹھے کر

رخصت ہوئے۔ اس سے پہلے رشید نے مجھے پیار کیا اور رخصت کرتے وقت حوصلہ بھی دیا۔

چونکہ سب سے نوعمر تھا۔ اس لیے مجھے سب سے پیچھے سیٹ پر بٹھا دیا گیا اور باقی 5 لوگ اپنی اپنی پسند کی سیٹوں پر براجمان ہو گیا ہے۔ حاجی صاحب ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکے تھے۔

سچی بات ہے کہ جب وین روانہ ہوئی تو میری سانس اٹک گئی میری ساری باہر جانے کی خوشی رفو چکر ہوگئی۔ میں سوچوں میں گم ہو گیا۔

''پتہ نہیں کتنا لمبا سفر ہے اور کب اور کیسے منزل پر پہنچیں گے''۔

منزل کا بھی کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا یہ تو صرف حاجی صاحب کو پتہ تھا کہ وہ ہمیں کہاں جا کر چھوڑیں گے۔

ماں ایک بار پھر بہت شدت سے یاد آئی اور اپنے آپ کو کوسنے لگا:

''میں نے اس طرح سے باہر جانے کا فیصلہ کیونکہ کیا اور ماں کو سیدھے صاف لفظوں میں کیوں نہیں کہہ دیا کہ میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا''۔

حاجی صاحب وین کو تیز چلا رہے تھے اور ہائی وے پر فراٹے بھرتی وین میں انہیں سوچوں میں گم کب نیند آئی کچھ معلوم نہیں تھا۔

تب آنکھ کھلی جب ایک جگہ پر لاہور سے کئی سو کلومیٹر دور وین رُکی تھی۔ یہ ایک ہوٹل تھا۔ یہاں پر ایک ایک کر کے سب اتر گئے تھے تو میں بھی ان کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ رفع حاجت وغیرہ سے فارغ ہو کر دوبارہ وین میں آ بیٹھے۔

ہمیں بتایا گیا تھا کہ ترکی پہنچنے میں ہمیں کئی دن لگ سکتے ہیں کیونکہ کوئٹہ سے ایران اور ایران سے سڑک کے ذریعے ترکی جانا تھا۔ ترکی سے آگے پھر یورپ میں داخل ہونا تھا۔

ایران داخل ہونے سے پہلے سرحد پر حاجی صاحب نے وہاں کے حکام کو بتایا کہ

وہ سیر کے لیے یہ گروپ لے کر مختلف ملکوں سے ہوتے ہوئے یورپ جا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ تمام ٹورسٹ ہیں۔

ان حکام نے ہمیں وین سے نیچے اتار کر نام پوچھے اور پاسپورٹ چیک کیے۔ وین کی چھت پر رکھے ہوئے سامان کو ٹٹول کر دیکھا اور ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔

ایران میں ہم نے کھانا کھایا کیونکہ کھانا حاجی صاحب کے ذمہ تھا۔ اس لیے وہ اپنی پسند کے ہوٹل پر رکتے اور بتاتے کہ یہاں یہ کھانا اچھا ملتا ہے اور سب مل کر کھانا کھا لیتے ہیں۔ گروپ میں دوسرے افراد آپس میں اس لیے بات چیت کر رہے تھے کہ وہ ایک دوسرے سے معلومات لے رہے تھے۔

وہ زیادہ پڑھے لکھے تھے جب کہ میں سکول سے بھاگا ہوا تھا اور مدرسہ میں پڑھ رہا تھا اس لیے میرے پاس کوئی تعلیم یا بات کرنے کا سلیقہ اور ہنر بھی نہیں تھا۔ بس ان کی باتیں سنتا رہتا تھا۔

مجھے بس اتنا یاد ہے کہ ہم ترکی پہنچے تو اس کے بعد حاجی صاحب نے کہاں کس ملک کے بارڈر کراس کیے کچھ علم نہیں' کیونکہ میں پڑھ بھی نہیں سکتا تھا' اگر کوئی بتا دیتا تو پتہ چل جاتا تھا۔ یہ ایک لمبا سفر تھا اور میرے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تھکا دینے والا بھی۔ یورپ کے سارے بارڈر کراس کرتے ہوئے حاجی صاحب بڑے اطمینان سے رہے اور کوئی پریشانی بھی نہیں ہوئی۔ ہم خود بھی حیران تھے کہ ہمیں کوئی کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔

لیکن پولینڈ میں قیام کے دوران سٹور پر پولیس کی پوچھ گچھ پر حاجی صاحب نے اپنی جس پریشانی کا اظہار کیا تھا وہ کافی مشکوک تھا۔

حاجی صاحب نے مجھے اصل معاملہ کہاں بتانا تھا' لیکن گروپ کے ایک ساتھی اکبر صاحب سے جب میں نے اس بابت پوچھا:

''اس واقعے کا کیا بنا اور آج سب کیوں پریشان تھے؟''

انہوں نے رازداری کے انداز میں بتایا:

''دراصل حاجی صاحب اس لیے پریشان تھے کہ اگر معاملہ بڑھتے ہوئے پولیس نے ان کی وین اور سامان کی تلاشی لے لی تو وہ پکڑے جا سکتے ہیں۔ حاجی صاحب نے وین میں دو اضافی بیٹریاں رکھی تھیں۔ ان بیٹریوں کے خول میں وہ افیون بھر کر لائے تھے جو حاجی صاحب نے یورپ میں اپنے کسی کلائنٹ تک پہنچانی تھی''۔

اگر ایسا ہو جاتا تو نہ صرف سب پکڑے جاتے بلکہ ان کا منصوبہ بھی ناکام ہو جاتا اور ایک بڑی رقم سے محروم ہو جاتے''۔

اس انکشاف پر میں تو چکرا کر رہ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کمال دماغ پایا ہے حاجی صاحب نے، یعنی ڈبل کاروبار ہو رہا تھا۔

مختلف چھوٹے چھوٹے ملکوں کے بارڈر کراس کرتے ہوئے حاجی صاحب بالآخر ہمیں لے کر ہالینڈ پہنچے اور ایک ہوٹل میں قیام کے بعد حاجی صاحب نے ہمیں مخاطب کیا:

''دوستو! آپ یورپ پہنچ گئے ہیں۔ اگلا بندوبست آپ نے خود کرنا ہے میرا کام یہاں تک تھا''۔

انہوں نے یہ تاکید کی تھی:

''آپ نے میرا کسی کو نہیں بتانا اور اگر ایسا کیا تو اس کا ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ آپ اپنی اپنی سٹوری کے ساتھ یہاں سے دوسرے ملکوں جہاں کوئی آپ کا بندوبست ہو سکتا ہے چلے جائیں''۔

باقی پانچوں لوگ تو پڑھے لکھے تھے وہ تو کسی اجنبی سے بات چیت بھی کر لیتے تھے۔ انہوں نے اپنے لیے ایڈجسٹ ہونے کا بندوبست بھی کر لیا تھا لیکن میرے لیے زبان کا بڑا مسئلہ تھا اور کوئی ہنر نہ ہونے کی وجہ سے بھی بہت پریشانی تھی۔

میں نے اپنے گروپ کے اکبر صاحب کو منت کر کے کہا:

''میرے یہ حالات ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ وہ میری مدد کریں کیونکہ میں تو کسی سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سمجھیں کہ میں اندھا ہوں۔ ظاہر ہے زبان کے بغیر اس طرح کے ملکوں میں آدمی اندھا ہی ہوتا ہے''۔

دو دن اسی طرح گزر گئے۔ اکبر صاحب نے کھانے پینے میں میری مدد کی اور حاجی صاحب کی 3 دن کی بکنگ کے بعد ہمیں ہوٹل سے بھی نکلنا پڑا۔ گروپ کے تین لوگ تو پہلے سے ہی اپنے کسی رشتہ دار یا جاننے والے کے ساتھ چلے گئے۔ ہم تین لوگ اکبر صاحب اور ملک صاحب رہ گئے جن کا کوئی جاننے والا یا ٹھکانہ نہیں تھا۔ میرے پاس جو رقم سفر کے لیے تھی وہ ختم ہو گئی۔

اکبر نے بھی مجھے کہا:

''بھائی اپنے لیے رقم کا بندوبست کرو ورنہ یہاں بہت مشکل ہو جائے گی''۔

میں نے اس سے درخواست کی اور بتایا:

''میرے بھائی یو کے میں ہوتے ہیں یہ ان کا نمبر ہے۔ آپ ان سے بات کریں ضرور وہ کچھ رقم مجھے بھیج دیں گے''۔

اتفاق دیکھیں کہ اللہ بے سہاروں کے لیے یہ کوئی نہ کوئی اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ ہم ایک شیڈ کے نیچے رہ رہے تھے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے سو لیتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی دکان تھی۔ کریانے کی اس دکان کو ایک بوڑھی عورت چلاتی چلاتی تھی۔ اس کے پاس کھانے پینے کی چیزیں بھی تھیں۔ میں یہ دیکھ کر دکان کے اندر چلا گیا۔ عورت جو بزرگ تھی، اس نے اپنی زبان میں کچھ مجھ سے پوچھا، جس کی مجھے سمجھ ہی نہیں آئی تو جواب کیا دیتا' پھر اس نے خود یہ اشاروں سے پوچھا:

''تم نے کچھ کھانا ہے؟''

میں نے اس کو جواب میں اشاروں سے بتایا:

''میرے پاس رقم نہیں ہے''۔

کچھ لمحے اس نے میرا حلیہ دیکھا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا:

''کوئی مسئلہ نہیں، تم نے جو کھانا ہے لے لو''۔

اشاروں کی زبان بھی دراصل دل کی زبان ہوتی ہے اور اللہ نے بڑی بی کے دل میں میرے لیے ہمدردی ڈال دی جس سے میرے کھانے پینے کا بندوبست ہو گیا۔

موسم اچھا تھا کہ ہمیں باہر بیٹھنے، لیٹنے میں اور چلنے پھرنے میں کوئی پریشانی نہیں تھی' کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اگر سردی کا موسم ہوتا تو ہم ٹھنڈ سے مر جاتے ہیں۔ میں آج بھی اس بڑی بی کو دعائیں دیتا ہوں' چند کچھ دنوں میں مَیں نے ڈچ زبان کے کچھ لفظ سمجھ لیے تھے اور ادا کرنے کے قابل ہو گیا تھا' کچھ اکبر صاحب نے مجھے سمجھا دیے تھے۔

اس لفظ کا کیا مطلب اس بڑی بی ہے سے اشاروں میں اور اپنی زبان میں مجھے یہ کہا:

''اگر تمہارے پاس رقم نہیں ہے تو تم یہاں سے کھا پی لیا کرو بعد میں رقم دے دینا''۔

میں سوچنے لگ گیا کہ اس اماں کو بھی اللہ نے کمال کا جگر اور حوصلہ دیا تھا کہ میرے جیسے مسکین پردیسی کو ادھار کھانا خوش دلی سے دے رہی تھی۔

اس نیک عورت نے میری جس طرح مدد کی اور سہارا دیا۔ میں زندگی بھر اس کو بھول نہیں پاؤں گا۔ اسی سٹور کا ایڈریس دے کر میں نے اپنے بھائی سے ایک ڈرافٹ یو کے سے منگوا لیا تھا۔ جیسے ہی میں نے ڈرافٹ کے بارے اکبر اور ملک صاحب کو بتایا تو ان کی کوشش تھی میں کسی طرح اس ڈرافٹ کو کیش کرواؤں تا کہ ہم اس رقم سے اپنا خرچہ بھی کریں۔ انہوں نے مجھ پر اپنے پاس سے کچھ خرچ کیے تھے لیکن میری کوشش یہ تھی کہ میں اس کو سنبھال کر رکھوں۔ میرا بندوبست اللہ نے اس عورت کے پاس کر دیا تھا۔ وہ کھانے پینے میں ہر طرح میرا خیال رکھتی تھی بلکہ اس نے دکان ہی کے کونے میں مجھے رہنے کے لیے بستر بھی لگا دیا تھا۔ اکبر اور ملک صاحب

نے پاس ہی اپنا بندوست کیا ہوا تھا' لیکن ہم روزانہ شوق سے بس سٹاپ پر اکٹھے ہوتے تھے اور اکٹھے ہی گھومتے پھرتے تھے۔ شہر دیکھنے نکلتے تو کہیں کام کاج ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتے' لیکن زبان نہ آنے کی وجہ سے بالخصوص مجھے تو ملتا ہی نہیں تھا۔ وہ دونوں کچھ نہ کچھ کام ڈھونڈ لیتے تھے۔

ایک شام ہم اکٹھے ہوئے تو ملک صاحب نے کہا:

''ہم تو کینیڈا جا رہے ہیں کیونکہ وہاں بڑی آسانی سے انٹری مل جاتی ہے اور وہاں کی شہریت بھی بعد میں مل جائے گی''۔

یہ سن کر میں پریشان ہو گیا۔

''یہ چلے گئے تو میرا کیا بنے گا؟ میں تو ادھر ہی رہ جاؤں گا''۔

میں نے ان دونوں کی منت سماجت کی:

''بھائیو۔ مجھے بھی لے چلیں مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جائیں ورنہ میں یہاں رل جاؤں گا''۔

جواب میں ملک نے پوچھا:

''تم وہاں کیا کرو گے' نہ تمہاری تعلیم ہے نہ تمہیں کوئی کام آتا ہے؟''

میں گڑگڑا کر بولا:

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں لیکن میں کوئی نہ کوئی محنت مزدوری والا کام کر لوں گا۔ آپ میرے لیے کوشش تو کریں میرے پاس رقم ہے۔ آپ میری ٹکٹ کا بھی بندوبست کر دیں''۔

یہ کہہ کر میں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

انہوں نے میری لاچارگی دیکھتے ہوئے حامی بھر لی اور بولے:

''ٹھیک ہے ہم تمہیں بھی ساتھ لے چلتے ہیں''۔

لیکن انہوں نے مطالبہ کیا کہ تم ہمیں پہلے وہ رقم واپس کرو جو ہم نے تم پہ خرچ کی

ہے۔ میں اس کے لیے تیار ہو گیا کیونکہ میں غرض مند تھا اور یہ موقع مل رہا تھا کہ میں ان کے ساتھ کینیڈا چلا جاؤں۔ مجھے ہالینڈ میں کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں یہاں کیا کروں گا؟

جس طریقے سے ان دونوں نے کینیڈا کے بارے میں بتایا تھا تو مجھے کچھ حوصلہ ہوا تھا کہ میں وہاں اپنا مستقبل بنالوں گا۔

ڈرافٹ کیش کروانے کے بعد انہوں نے جتنی رقم ٹکٹ کے لیے مانگی میں نے دے دی اور حساب کتاب میں انہوں نے جتنے میرے اوپر خرچ کیے تھے وہ بھی میں نے ان کو ادا کر دیے۔

اگلے ہفتے کی فلائٹ سے ہم کینیڈا کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ دکان والی اس نیک دل عورت سے بھی مجھے اپنی والدہ کی طرح لگاؤ اور انسیت ہو گئی تھی۔ جس طرح مشکل وقت میں اس نے میرا خیال رکھا تھا اور مدد کی تھی وہ کوئی ماں ہی کر سکتی ہے۔

میں ایک بار پھر یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے افسردہ تھا۔

لیکن جب میں حسب وعدہ وہ رقم دینے کے لیے جو اس نیک دل عورت نے کھانے پینے کا ادھار مجھے اتنے ہفتوں میں دیا تھا دکان میں گیا تو وہ حسب سابق بڑے نرم لہجے اور پیار سے بولی:

''میرے بیٹے! کیسے ہو کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں؟''

''مام'' مجھے بھوک نہیں ہے''۔

اس کے بعد میں نے اپنے ہاتھ میں رکھی رقم اس کے سامنے کر دی اور بولا:

''آپ اس میں سے جتنی رقم آپ کے حساب سے کتاب بنتی ہے لے لیں۔ مجھے کوئی حساب نہیں آتا' کیونکہ آج رات میں کینیڈا روانہ ہو جاؤں گا''۔

اس نے مسکرا کر ہاتھ کے اشارے سے پہلے منع کیا مگر میرے اصرار پر اس نے

صرف ایک نوٹ اوپر سے اٹھالیا اور پھر مجھے گلے لگالیا۔ میں نے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

اب میں ڈچ زبان کے کچھ بنیادی الفاظ سمجھنے لگا تھا۔ مجھے سمجھ آیا:

''وہ کہہ رہی تھی کہ تم بہت اچھے لڑکے ہو اور میں نے تمہاری مدد کر کے کچھ نہیں کیا' بلکہ یہ تو ہماری قسمت ہے کہ تم نے اتنے دن یہاں گزارے اور میں دعا کرتی ہوں کہ تم جہاں بھی جاؤ کامیاب رہو''۔

میں وہاں سے نکلا تو میری آنکھیں بھی تر تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ:

''دیکھو دنیا کتنی چھوٹی ہے اور بڑی ہے کہ آپ کو کسی جگہ بھی ماں کا روپ مل سکتا ہے''۔

اکبر اور ملک صاحب کے ساتھ جہاز میں سوار ہو گیا اور ہم کئی گھنٹے کی فلائٹ کے بعد کینیڈا میں ٹورانٹو اتر گئے۔

امیگریشن کاؤنٹر پر جو بھی سوال و جواب ہوئے اکبر اور ملک صاحب تو جواب دے کر گزر گئے۔ مجھے انگریزی کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی تو جب آفیسر نے محسوس کیا کہ میں انگلش نہیں سمجھ یا بول پا رہا تو اس نے ٹرانسلیٹر کو بلا لیا۔ ٹرانسلیٹر پنجابی سردار تھا۔ اس کو میں نے بتایا:

''میں اس طرح لاہور سے آ رہا ہوں اور یورپ سے ہوتا ہوا کینیڈا آیا ہوں''۔

مجھے پوچھا:

''تم کینیڈا رہنے کے لیے آئے ہو؟''۔

''ہاں ارادہ تو یہی ہے''۔

میں نے جوب دیا۔

اس نے کہا:

''ٹھیک ہے تم فکر نہ کرو میں تمہاری طرف سے اس کو بتا دیتا ہوں۔ امید ہے تمہارا

کام بن جائے گا''۔

یہ بھی اللہ کی طرف سے میری مدد ہوگئی کہ سردار نے خود ہی اس کو بتایا کہ یہ شخص یہاں گھومنے پھرنے کے لیے آیا اور اس کے پاس رقم بھی ہے۔

سردار نے پہلے ہی مجھ سے پوچھ لیا تھا کہ اگر آپ کے پاس معقول رقم ہے تو یہ آپ کو یہاں انٹری ویزا دے دیں گے اور تم یہاں بعد میں اپنے سٹیٹس کے لیے اپلائی کر سکتے ہو' چنانچہ ایسا ہی ہوا مجھے انٹری مل گئی۔

میں خوش خوش جب باہر آیا تو اکبر اور ملک صاحب کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔

دونوں کو ان کے دوست لینے آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو کہا:

''میرا تو یہاں پر کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ آپ کچھ دنوں کے لیے میری مدد کر دیں اس کے بعد میرا کوئی نہ کوئی سبب بن جائے گا''۔

جو بندہ انہیں لینے آیا ہوا تھا اسے بھی مجھ پر ترس آ گیا۔ اس نے کہا:

''آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں''۔

میں نے ان کو کہا:

''میں آپ کو رہائش کے لیے کرایہ ادا کروں گا اور آپ مجھے کوئی مزدوری کا کام بھی ڈھونڈ دیں''۔

وہ ایک نیک دل آدمی تھا۔ اکبر اور ملک صاحب بھی اس کو منع نہیں کر سکے۔ شاید اللہ نے میرے لیے اس کے دل میں ہمدردی ڈال دی تھی۔ دو دن بعد احمد نامی اس شخص نے میرے لیے ایک فیکٹری میں کام کا بندوبست بھی کر دیا' جبکہ اکبر اور ملک صاحب دفتر کی نوکری ڈھونڈنے کے چکر میں لگے ہوئے تھے۔

احمد ان کو کہہ بھی رہا تھا:

''ان کی فیلڈ کی جاب شاید ان کو جلدی نہ مل سکے۔ اس لیے اگر وہ کوئی اور

کام شروع کر دیں تو ان کے لیے بہتر ہوگا''۔

فیکٹری کی جاب پر چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر رکھنا اور پیکنگ کرنا شامل تھا۔ میں نوجوان تھا اس لیے مجھے اس جاب کو کرنے میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اسی جاب پر ایک پنجابی سردار سے میل ملاقات بڑھی تو میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا اور پوچھا کہ مستقل رہائش کے پیپرز لینے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟

وہ پڑھا لکھا ایک آدمی تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ خود بھی میری طرح پیپرز کی تلاش میں ہے۔

کہنے لگا:

''ایک وکیل سے اس بارے بات چل رہی ہے اور میں اس کو آپ کے بارے میں بھی بتا دوں گا' ہوسکتا ہے ہم دونوں کا کیس وہ اکٹھے ہی فائل کر دے''۔

میں نے حامی بھر لی کیونکہ میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کینیڈا میں رہنے کا کوئی پکا سبب بن جائے۔

اگلے ماہ اس سردار نے مجھے بتایا:

''وکیل نے کہا ہے کہ ہمیں ٹورانٹو کی بجائے دوسرے شہر صوبے میں جا کر رہنا ہوگا۔ وہاں بڑی آسانی سے پی آر کے لیے پراسیس ہوسکتا ہے''۔

کینیڈا میں رہتے ہوئے میں لاہور میں اپنی والدہ کو ہر مہینے فون کر کے اپنی خیریت کا بتاتا رہتا تھا کیونکہ فون کرنا بہت مہنگا پڑتا تھا۔ دو سے تین ڈالر منٹ کی ایک کال ہوتی تھی تو کچھ زیادہ لمبی بات نہیں ہوسکتی تھی لیکن بس میں اپنی خیریت کے بارے میں بتاتا تو والدہ مطمئن ہو جاتی۔ میں اسے کہتا:

''آپ دعا کریں میرا یہاں کام بن جائے''۔

چھ ماہ بعد فیکٹری میں کام کرتے ہوئے میں نے کچھ بچت بھی کر لی تھی اور اپنے کیس کے سلسلے میں وکیل کو ایک ہزار ڈالر بھی دے دیے تھے جو بہت بڑی رقم تھی۔ اس کی فیس کے بغیر کیس آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔

چنانچہ وکیل نے ایک دن بتایا کہ انہیں دوسرے صوبے مینی ٹوبہ جا کر مستقل شہریت کے لیے انٹرویو دینا ہوگا اور میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ سردار کا کیس بھی ساتھ ہی تھا۔

پروگرام کے مطابق ہم وہاں گئے تو ہمارا انٹرویو ہوا۔ وہاں پر آفیسر نے پوچھا: تو وکیل نے میرے بارے میں بتایا کہ یہ نوجوان آدمی ہے یہ ہر کام کر سکتا ہے۔ اس نے اس سے پہلے میرے کام اور تجربے کے کچھ ڈاکومنٹ بھی ساتھ لگائے جنہیں آفیسر نے غور سے دیکھا اور پھر اس نے میرے کیس کی منظوری دیتے ہوئے مجھے مبارکباد دی تو میرا چہرہ کھل اٹھا اور میں نے آفیسر کا شکریہ ادا کیا' باہر نکل کر وکیل نے بھی مجھے مبارکباد دی۔

میں نے فون کر کے اپنی والدہ کو اس بارے میں بتایا:

''آپ کی دعائیں رنگ لائی ہیں اور مجھے یہاں پر پیپر مل گئے ہیں اور اب میں یہاں رہ کر کام بھی کر سکتا ہوں''۔

میں نے یو کے میں بھائی کو بھی فون کر کے اپنی اس کامیابی کے بارے میں بتایا تو وہ بھی خوش ہو گیا

کینیڈا میں میرے لیے انگریزی زبان مسئلہ تھی لیکن چونکہ میں فیکٹری میں جسمانی کام کر رہا تھا اس لیے آہستہ آہستہ کچھ لفظ بھی سیکھتا جا رہا تھا۔ ہیلو ہائے اور کچھ اور لفظ بھی میں نے سمجھنا اور بولنا شروع کر دیے تھے۔ نئی جگہ پر مجھے ایک فیکٹری میں جاب مل گئی اور اس جگہ سردی بہت زیادہ تھی اور مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔

سردی کی وجہ سے مجھے بس میں فیکٹری جانا پڑتا تھا کیونکہ میرے پاس ابھی

ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں آیا تھا۔ بس سٹاپ پر بس میں بیٹھنے اور اترنے میں بھی بڑی مشکل اس لیے تھی کہ سٹاپ کا نام پڑھنا لکھنا نہیں آتا تھا۔ اس لیے فیکٹری میں کام کرنے والے کچھ اور لوگوں کی شکلیں بھی مجھے یاد تھیں۔ جہاں وہ اترتے تھے وہیں میں بھی اتر جاتا تھا۔

سردی کی وجہ سے مجھے شدید زکام ہو گیا اور میں اسی طرح فیکٹری گیا تو مجھے بار بار چھینک آنے پر سپر وائزر نے مجھے پوچھا:

''آر یو سک'' تو میں نے اس کا جواب دیا:

''نو آئی ایم مسلم''

یہ سن کر وہ ہنس پڑا کیونکہ میں سمجھا مجھے پوچھ رہا ہے کہ میں سکھ ہوں بعد میں مجھے اندازہ اس وقت ہوا جب یہ پتہ چلا کہ کینیڈا میں ''سک'' بیمار کو کہتے ہیں' تب یہ سمجھ آئی کہ سپر وائزر ہنسنے کیوں لگ گیا تھا میرے جواب پر۔ ابتدائی دنوں کے یہ حالات اور بول چال میں کبھی نہیں بھول پایا۔

جب میں نے ٹورانٹو میں رابطہ کر کے اکبر اور ملک صاحب سے پوچھا کہ کیا حالات ہیں؟ دونوں نے بتایا کہ ہمارے امیگریشن کا پروسیس ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔ جب ان کو میں نے بتایا کہ میرا تو یہاں پر ہو گیا ہے تو وہ بڑے حیران ہوئے کہ تمہارا کیسے ہو گیا؟

میں نے جواب میں کہا:

''ان پڑھ بندوں کا بھی تو اللہ مالک ہوتا ہے۔ اس لیے میرا سبب بن گیا۔ آپ مجھے کہا کرتے تھے کہ تم کینیڈا جا کر کیا کرو گے؟ نہ تم پڑھے لکھے ہو نہ تمہیں کچھ آتا ہے۔ دیکھ لو اسی طرح کی باتوں سے اللہ اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے''۔

میں نے ان کو خوب یاد دلایا:

پیپر ملنے میں مجھے دو سال لگ گئے۔ اس دوران میں نے ارادہ کیا ہوا تھا کہ جیسے ہی معقول رقم کی بچت ہوگی تو میں پاکستان جاؤں گا۔

اپنے پروگرام کے مطابق میں پاکستان آیا۔ اپنی والدہ سے ملا اور اتنے سالوں کی جدائی کے بعد ان کو ملنا کس قدر خوشی اور اطمینان کی بات تھی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

ایک ماہ لاہور میں رہنے کے بعد میں دوبارہ کینیڈا پہنچ گیا۔ میں والدہ سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ آئندہ دو سال بعد جب آؤں گا تو شادی کروں گا کیونکہ ماں نے میرے لیے ایک رشتہ ڈھونڈ رکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں جلد از جلد شادی بھی کرلوں۔

اگلے دو سال بھی تیزی سے گزر گئے اور میں پاکستان پہنچ گیا۔ میرے پاس شادی پر خرچ کرنے کے لیے اچھی رقم موجود تھی۔

شادی اپنے رشتہ داروں میں دھوم دھام سے ہوگئی۔

ایک مہینے کی چھٹی کے بعد میں دوبارہ کینیڈا جا کر کام کر لگ گیا۔ ایک مہینے میں وکیل کے ذریعے اپنی بیوی کا کیس فائل کیا تو چار ماہ کے اندر اندر میری بیوی کا ویزہ بھی لگ گیا۔ میں اپنی جاب سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر لاہور آیا تا کہ میں والدہ کو مل لوں اور بیوی کو ساتھ لے آؤں۔

میں بہت خوش تھا اور میری ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں کیونکہ اس سے پہلے میں اکیلا رہنے کا عادی تھا۔ جدھر دل کیا منہ اٹھایا اور چل دیتا تھا لیکن اب مجھے اندازہ تھا کہ پابندی میں زندگی بسر ہوگی۔ بیوی نے بھی گھر پر اکیلے بیٹھ کر بور ہونے کی بجائے کہا کہ وہ بھی کوئی جاب کر لیتی ہے۔ اسے ایک پیزا بنانے کی فیکٹری میں جاب مل گئی۔ شام کو ہم دونوں اپنے اپنے کام سے گھر آ چکے ہوتے تھے۔ ویک اینڈ ہم دونوں باہر گھوم پھر کر گزارتے تھے کیونکہ میں نے ڈرائیونگ لائسنس بھی پاس کرلیا تھا جو کہ ایک بہت مشکل کام تھا' لیکن اس میں بھی ماں کی دعائیں کام آئیں اور اللہ نے میری مدد کی۔ اب میں بیوی کو گاڑی میں اس کی جاب پر بھی ڈراپ کرنے لگا تھا اور اس کے بعد اپنے کام پر چلا

جاتا تھا۔ اتنے سالوں میں میری انگریزی بھی بہتر ہوگئی تھی اور میں نے فیکٹری کی جاب چھوڑ کر ٹیکسی کا لائسنس بھی لے لیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فل ٹائم ٹیکسی چلاؤں گا کیونکہ اس میں بڑی اچھی آمدنی ہو رہی تھی۔

ایک سال ٹیکسی چلانے کے بعد میں اس قابل ہو گیا کہ اس سے اپنے لیے گھر خرید سکوں۔

ٹیکسی میں ایک اور پاکستانی ڈرائیور کے ساتھ میری اچھی سلام دعا ہوگئی اور اس سے روزانہ ملاقات اور بات چیت ہوتی تھی۔ اس نے مجھے ٹیکسی کے معاملات میں بہت گائیڈ بھی کیا تھا۔

اس نے بتایا کہ وہ امریکہ اپنے رشتہ داروں کے پاس جا رہا ہے کیونکہ اس کے بیوی کے بھائی وہاں رہتے تھے اور وہ سمجھتا تھا کہ امریکہ میں وہ بہتر زندگی گزار سکے گا۔ وہ اپنا گھر بیچ کر جانا چاہتا تھا۔ جب مجھے پتہ چلا تو میں نے کہا:

''میں اس سے گھر خرید لیتا ہوں''۔

جب میں نے اس کو بتایا تو اس نے کہا:

''ٹھیک ہے اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے کہ تم میرا گھر خرید لو''۔

گھر کے لیے ایڈوانس رقم بھی میں نے اس کو دے دی۔ ہم نے دیکھا گھر اچھا تھا اور اس میں فرنیچر و دیگر سامان بھی اچھی حالت میں تھا۔

ایک مہینے بعد اس کا پروگرام امریکہ جانے کا تھا اور اس نے ہمارے ساتھ مکان فروخت کرنے کے معاملات بھی طے کر لیے تھے۔

اس نے کہا کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ گھر میں جو فرنیچر اور چیزیں پڑی ہیں وہ بھی آپ کو دے دیتا ہوں کیونکہ ابھی نئی ہیں۔ آپ نے بھی یہ چیزیں خریدنی ہیں اور مجھے یہاں سے لے جانے میں بہت رقم خرچ کرنی پڑے گی اور میرا بھی فائدہ ہو جائے گا۔

میں نے اس پر اپنی بیوی کے مشورے سے حامی بھر لی' کیونکہ وہ چیزیں دیکھ چکی

تھی۔ جیسے جیسے اس کے جانے کے دن قریب آ رہے تھے میں نے اس سے تقاضا کیا کہ وہ ہمیں جانے سے پہلے گھر کی چابی دے دے لیکن وہ ٹال مٹول اور بہانہ بازی سے کام لیتا رہا۔

آج دے دوں گا' کل دے دوں گا کہہ کر ٹالتا رہا اور چابی نہیں دی۔

ہم نے مروت میں اس کی بات کا یقین کر لیا کہ یہ خود ہی چابی دے دے گا لیکن جب مقررہ تاریخ پر چابی نہیں ملی تو میں نے اس کو فون کیا۔ اس نے بتایا کہ میں گھر چھوڑ چکا ہوں اور امریکہ پہنچ گیا ہوں۔ گھر کی چابی فلاں دوست کو آتے ہوئے میں نے پکڑائی تھی آپ اس سے لے لیں۔ دوست سے چابی لے کر بیوی کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ تمام گھر خالی پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم ہکا بکا رہ گئے۔ اس نے ہمارے ساتھ کیا فراڈ کیا تھا اور سامان کسی کو فروخت کر گیا تھا۔ حالانکہ وہ ہم سے اس فرنیچر اور سامان کی رقم وصول کر چکا تھا۔ اس کے بعد جب ہم نے اس کو فون کیا تو اس کا فون کبھی نہیں ملا' کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ اس نے جو حرکت کی ہے اس کے بعد وہ ہمارا فون سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ہم اس پر صبر شکر کر کے بیٹھ گئے۔

اس کے بعد بھی ہر نئے آنے والے کو میں نے اپنے ابتدائی حالات میں مشکلات اور تکلیف کو ذہن میں رکھ کر مدد کی اور زیادہ تر نے اس کا ناجائز فائدہ ہی اٹھایا اور ادھار لی ہوئی رقم کبھی واپس نہیں کی' کسی نیکی اور ہمدردی کا کبھی ایسے بندوں سے صلہ نہیں ملا۔ پتہ نہیں یہ زمین ہی ایسی ہے کہ ادھر آ کر اچھے بھلے لوگوں کو کیا ہو جاتا ہے؟

ہم نے بھی کبھی گلہ نہیں بلکہ اللہ کا شکر ادا کیا کہ اسی میں ہماری بہتری لکھی ہو گی۔

...9

کینیڈا آ کر ابتدائی دنوں میں بننے والے دوستوں میں سے جمیل صاحب اچھے اور بھلے آدمی تھے۔ان سے باقاعدگی سے فون پر رابطہ رہتا تھا اور ملاقات بھی ہو جایا کرتی تھی۔

اکثر اپنی ذاتی معلومات بھی شیئر کر لیتے تھے۔اپنے بچوں کے بارے میں ایک دن بتانے لگے کہ ان کے دونوں بیٹے کینیڈا میں ہی پیدا ہوئے۔

بڑے بیٹے نے یونیورسٹی سے بی کام کی ڈگری حاصل کی۔اس دوران وہ ایک کافی شاپ پر بھی جاب کیا کرتا تھا۔

جمیل صاحب بتانے لگے:

''اب وہ کبھی اس کافی شاپ پر کافی لینے کے لیے جاتے ہیں تو وہاں موجود ورکر کو ایک ڈالر کی کافی لے کر دو ڈالر ٹپ دیتے ہیں۔اس پر ورکر حیران رہ جاتے ہیں۔میں خوش ہوتا ہوا ڈرائیو تھرو میں گاڑی آگے بڑھا دیتا ہوں''۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟

جواب میں انہوں نے بتایا:

''میرا بیٹا چونکہ یہاں جاب کرتا تھا،تب مجھے وہ یاد آ جاتا ہے اور میں یہ ٹپ اس کی موجودگی کے احساس کے لیے دیتا ہوں''۔

میری نظر میں جمیل صاحب نہ صرف اچھے بلکہ ہمدرد انسان بھی تھے۔

انہوں نے بتایا کہ بی کام کرنے والے بیٹے نے ملازمت کے لیے کینیڈا کی مختلف کمپنیز اور دفاتر میں سیکڑوں بار اپلائی کیا مگر اس کو کہیں جاب نہیں ملی۔

اسے اس کی بدقسمتی کہہ لیں یا کچھ اور۔

ہم میاں بیوی بھی بہت پریشان ہوئے کہ یونیورسٹی ڈگری مکمل کرنے کے باوجود بیٹے کو ملازمت نہ ملنا ایک آزمائش ہے۔

جمیل صاحب نے کہا کہ میرے بیٹے نے تھک ہار کر کینیڈین آرمی جوائن کر لی کیونکہ ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے وہ گھر تو بیٹھ نہیں سکتا تھا۔

ایک دن خوشی سے انہوں نے بتایا کہ اگلے ہفتے ان کے بیٹے کی پاسنگ آؤٹ ہے۔اس میں شرکت کے لیے میاں بیوی دوسرے شہر جا رہے تھے۔

جمیل صاحب کے بیٹے کی پاسنگ آؤٹ ہوگئی اور وہ بہت خوش تھے۔انہوں نے بیٹے کے ساتھ گریجویشن کی تصویریں بھی مجھے دکھائیں جس میں وہ بڑے خوش دکھائی دے رہے تھے۔ بیٹے کو یونیفارم پہنے ہوئے پیار کرتے ہوئے ان کی تصاویر بہت زبردست تھیں۔

اس پاسنگ آؤٹ کے بعد بھی ہماری فون پر گاہے بگاہے بات ہوتی رہی اور چند ماہ گزر گئے۔

ایک دن جمیل صاحب کو میں فون کر رہا ہوں تو وہ فون نہیں اٹھا رہے تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی اور سوچا کہ کہیں ان کی طبیعت خراب تو نہیں ہے؟

جب انہوں نے مسلسل فون نہ اُٹھایا تو میں ان کے گھر چلا گیا۔ میں نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔اندر سے ان کی بیگم نے پوچھنے پر بتایا:

''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ سو رہے ہیں''۔

میں وہاں سے چلا آیا اور اس کے بعد دوبارہ میں نے ان کو فون کیا تو انہوں نے فون پر کوئی بات نہیں کی۔ مجھے بڑی پریشانی اور تجسس تھا۔

میں نے ایک اور دوست سے ان کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ملیں گے؟

دوست نے بتایا کہ وہ اس کا فون بھی نہیں اٹھا رہے اور اسے بھی بہت حیرت اور

تشویش ہے۔

ہم دونوں دوستوں نے فیصلہ کیا:

''ان کے گھر کے باہر جا کر بیٹھ جائیں گے' اگر وہ گھر سے باہر نکلیں گے تو ان کو روک لیں گے اور پوچھیں گے کہ وہ فون کیوں نہیں اٹھا رہے''۔

ایک دن پروگرام کے مطابق جمیل صاحب کے گھر کے باہر گاڑی میں چھپ کر بیٹھے تھے کہ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گلی کے نکڑ پر پہنچے تو ہم نے احتیاط سے گاڑی ان کے سامنے لگا کر ان کو روک لیا۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور گاڑی میں بیٹھے رہے۔ ہمارے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ ہم دونوں گاڑی کا دروازہ کھول کر ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور پوچھا:

''کیا بات ہے آپ ناراض ہیں؟''

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا' کچھ دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد ہم نے ان سے پھر پوچھا:

''کچھ تو بتائیں، بات کیا ہے، کیا پریشانی ہے؟''

بالآخر وہ گویا ہوئے:

''میں معذرت چاہتا ہوں میں آپ کا فون نہیں اٹھا سکتا کیونکہ میری حالت ہی کچھ ایسی ہے۔''

ہم نے بڑے نرم لہجے میں کہا:

''بتائیں گے نہیں تو ہمیں پتہ کیسے چلے گا؟''

وہ بولے میں بتانا تو نہیں چاہتا تھا مگر آپ بہت اصرار کر رہے ہیں تو سنیں:

''اپنے بیٹے کے کینیڈین آرمی میں کمیشن پر میں بہت خوش تھا لیکن ہفتہ پہلے مجھے ایک فون آیا جو کچھ یوں تھا۔

''میں کینیڈین فورسز سے بول رہا ہوں۔ ہم آپ کے بیٹے کو افغانستان بھیج

رہے ہیں اور آپ کو ''پینک'' کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس کا خیال رکھیں گے''۔

جمیل صاحب نے بتایا:

''یہ سننا تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ہم میاں بیوی کو زمین گھومتی نظر آنے لگی تھی۔ ہم اس قدر پریشانی کے عالم میں تھے کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس سے پہلے کینیڈین فوجیوں کی افغانستان میں لڑائی میں ہونے والی اموات کے بارے میں ہم نے خبروں میں سن رکھا تھا۔

ہماری کیا حالت ہے یہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ اسی لیے میرا کسی سے بات کرنے کو دل چاہتا ہے اور نہ میں اس قابل ہوں۔ ہماری پریشانی اور دکھ ہم ہی جانتے ہیں۔

حتیٰ کہ ہم میاں بیوی آپس میں بات نہیں کر پاتے کیونکہ ہم ایک انجانے خوف کا شکار ہو گئے ہیں اور خود کو بے بس اور لاچار سمجھ رہے ہیں''۔

جمیل صاحب نے ایک سرد آہ بھری اور گویا ہوئے:

''آپ ہمارے لیے دعا کریں آپ کی مہربانی کہ گھر تک آ کر یہاں روک کر کوشش کی اور پوچھا کہ ہم کس حال میں ہیں؟''

ہم نے اسے حوصلہ دیا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات ہرگز نہیں بدلے اور ہم بھی ان کے بیٹے کی سلامتی کی دعا دیتے ہوئے گاڑی سے اتر کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھے اور افسردگی میں وہاں سے چل دیے۔

اس کے بعد بھی جمیل صاحب نے ہماری کال نہیں اٹھائی حالانکہ ہمیں پتہ تھا کہ وہ کس کیفیت سے گزر رہے ہیں، لیکن پھر بھی دوستوں کی حیثیت سے ان سے بات کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک بار میں نے اپنا نمبر بلاک کر کے جب ان کو کال کی تو انہوں نے اٹھا لیا تو میں نے اپنا بتایا اور پوچھا: ''آپ کا کیا حال ہے؟''

انہوں نے بس اتنا کہا:

''یار کوئی کام ہے تو بتاؤ ورنہ میں کوئی بات نہیں کر سکتا''۔

اور فون بند کر دیا۔ ڈیڑھ سال بعد ان کا بیٹا افغانستان سے کینیڈا واپس آیا تو ہمیں کہیں سے پتہ چل گیا۔

جمیل سے ملنے دوست کے ساتھ ان کے گھر چلے گئے۔ ساتھ میں ہماری خواتین بھی تھی۔ جمیل صاحب بظاہر تو خوش تھے لیکن بات کرتے ہوئے کہنے لگے:

''ہمیں ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہمارا بیٹا واپس آ گیا ہے۔ پچھلے ڈیڑھ سال جس دُکھ اور پریشانی سے گزرے ہیں وہ ڈیڑھ سال نہیں ساری عمر لگ رہی تھی''۔

جمیل صاحب کی بیگم نے خواتین کو بتایا کہ جب ہم ایئرپورٹ پر اپنے بیٹے کو ریسیو کرنے گئے تو اسے سامنے پا کر اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا اور جمیل صاحب بیٹے کو گلے لگا کر دھاڑیں مار مار کر روتے رہے اور چومتے رہے کہ وہ زندہ سلامت واپس آ گیا ہے۔

انہوں نے مزید بتایا کہ بیٹے نے وہاں اپنی ڈیوٹی اور حالات کے بارے میں جو ہمیں واقعات بتائے ہیں وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والے تھے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس کا زندہ بچ جانا ایک معجزے سے کم نہیں ہے کیونکہ اس کی غیر موجودگی میں وہ اللہ سے گڑگڑا کر اس کی سلامتی اور زندگی کے لیے دعائیں کرتی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں سن لیں اور خطرناک حالات میں بھی اللہ نے اس کی جان کی حفاظت فرمائی۔ بیٹے کے واپس آنے پر ہمارے دلوں کو ٹھنڈک ملی ہے اور باقی سکون بھی آ جائے گا۔

...10

ٹورانٹو آئے ہوئے ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ ایک دوست نے کہا:

''آپس کی بات ہے کینیڈا میں چاہے کوئی نیا ہو یا یہاں دہائیوں سے رہ رہا ہو فارغ بیٹھنا افورڈ نہیں کر سکتا۔

یہاں اخراجات بہت ہوتے ہیں اس لیے کوئی نہ کوئی کام تو کرنا پڑے گا۔

آپ ذہنی طور پر کام کے لیے تیار رہیں میں کسی دوست کے ذریعے جاب ڈھونڈتا ہوں''۔

دوست نے مجھے کام پر جانے ترغیب دے ڈالی

اگلی شام ان کے ایک دوست حاجی صاحب تشریف لائے تو ان سے میرا تعارف کروایا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں دفتر کی جاب تھی۔

حاجی صاحب کہنے لگے:

''یہ بہت اچھا ہوا آپ فیملی کے ساتھ کینیڈا آ گئے۔ ویلکم ٹو کینیڈا''۔

پھر کہنے لگے:

''پاکستان اور کینیڈا میں کام کے بارے میں شروع کے دنوں معاملات اور حالات بالکل ہی مختلف ہوتے ہیں۔ عام مزدوری سے شروع کر کے آگے چل کر آپ کو اپنی پسند کی جاب بھی مل سکتی ہے لیکن فوری طور پر ممکن نہیں ہوتا''۔

پھر گویا ہوئے:

''ہر ایک نے ابتدائی دنوں میں سختی برداشت کی ہے۔ میں خود پاکستان میں

ویل سٹیلڈ تھا، دفتر، گاڑی اور نوکر کی سہولت تھی مگر یہاں آ کر پتہ چلا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ زیرو سے شروع کرنا ہوگا''۔

اس دوران چائے آ گئی اور حاجی صاحب نے ایک دو لطیفے بھی سنائے چائے کے بارے میں تو محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

ہم چونکہ اپنے دوست کے گھر عارضی طور ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ کوشش کر رہے تھے میرے لیے الگ رہائش سے پہلے جاب کا بندوست ہو جائے تا کہ یہاں کی آمدنی سے اخراجات چلانے کا آغاز ہو۔

حاجی صاحب نے پھر بات شروع کی:

''میں آپ کو سچی بات کہتا ہوں کہ کینیڈا آ کر گھر میں بیٹھنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہی ہوتا ہے اور کئی سال یہاں رہنے اور کام کرنے کا نچوڑ یہ ہے کہ یہاں پر ایک دن کام سے چھٹی یا ناغہ کرنا حرام کے زمرے میں آتا ہے''۔

مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''ابھی آپ کے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہے اور نہ گاڑی ہے۔ اس لیے آپ کہیں گھومنے پھرنے بھی نہیں جا سکتے۔ یہ آپ ہی نہیں ہر ایک نئے آنے والے کے ساتھ ہوتا ہے''۔

حاجی صاحب نوجوان ہی تھے اور خوشگواری سے بات کر رہے تھے۔ کہنے لگے:

''ہم نے بہت سے نئے آنے والے دوستوں کو ابتدائی طور پر دستیاب جاب لینے میں مدد کی ہے اس کے بعد انہوں نے اپنے لیے رستے بنا لیے تھے۔ آج وہ سیٹ ہیں ماشاءاللہ اور ہمیں یہ اچھا لگتا ہے''۔

اتنی دیر میں بیل ہوئی تو ہمارے دوست ایک بھاری بھرکم صاحب کو اپنے ساتھ اندر لے آئے۔

جیسے ہی وہ سامنے آئے حاجی صاحب نے با آواز بلند کہا:

''آیئے ادریس بھائی کہاں رہ گئے تھے''؟

''آپ کو تو پتہ ہے بھائی' شام کے بعد اس طرف آتے ہوتے بے تحاشہ ٹریفک ہوتی ہے۔اس میں اٹک گیا تھا۔''

حاجی صاحب نے بتایا کہ یہ ادریس بھائی ہیں۔ان کا تعلق کراچی سے ہے اور آٹھ سال پہلے کینیڈا آئے تھے۔کراچی میں ان کی اعلیٰ سرکاری ملازمت تھی۔خزانے کے مالک تھے۔

''خزانے کے مالک؟''

میں نے سوال کیا تو ادریس بھائی کہنے لگے:

''میں وہاں ٹریژری میں کام کرتا تھا جس کا اُردو ترجمہ خزانہ ہے،''

''کس عہدے میں کام کررہے تھے آپ وہاں''۔

میں نے اپنی معلومات کے لیے پوچھا:

''میں جنرل مینجر تھا اور ریٹائرمنٹ کے بعد یہاں آ گیا''۔

جواب میں ادریس بھائی نے اپنی ریٹائرمنٹ کا ذکر بھی کر دیا۔

میں بڑا متاثر ہوا کہ اتنے بڑے عہدے پر کام کرنے اور بڑی تنخواہ لینے والا شخص کینیڈا آیا ہے تو یہاں بھی اچھی جاب ملی ہوگی۔

اسی چکر میں نے میں نے ایک اور سوال کر دیا:

''کینیڈا میں کوئی جاب کررہے ہیں آپ؟''

جواب میں ادریس بھائی نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا:

''کچھ خاص فرق نہیں پڑا عہدے (ڈیزیگنشن) میں یہاں آ کر بھی۔وہاں جنرل منیجر تھے یہاں جنرل لیبر ہیں''۔

یہ سننا تھا کہ کمرے میں میرے سمیت تمام حضرات نے قہقہہ لگایا۔

ادریس بھائی بھی ان کی لفاظی پر انجوائے کرنے پر زیر لب مسکرانے لگے۔

حاجی صاحب جو خاموشی سے ادریس بھائی کو سن رہے تھے اس ہنسی مذاق کے بعد بولے:

''دراصل ادریس بھائی کو آپ کی جاب کے لیے ہی بلایا تھا۔ اپنے کام کے ساتھ ساتھ یہ ایک ایمپلائمنٹ ایجنسی بھی چلاتے ہیں اور ان کے پاس فیکٹری یا وئیر ہاؤس کی جابز ہوتی ہیں۔ انہوں نے بہت سے نئے آنے والے پاکستانیوں کو کام دلایا ہے۔

ادریس بھائی آپ ہمارے ان دوست کے لیے بھی کچھ آسان سی جاب کا جلدی بندوبست کر دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی''۔

میری جاب کی یہ درخواست کرتے ہوئے حاجی صاحب نے ادریس بھائی کی طرف التجایہ نظروں سے دیکھا۔

''انشاللہ ایک دو دن میں ان کو ہم جاب پر کھڑا کر دیں گے''۔

ادریس بھائی نے ہم تینوں کی طرف باری باری دیکھا اور کہنے لگے:

''اب اجازت دیں''۔

ان کے ساتھ ہی حاجی صاحب نے میرے دوست کی طرف دیکھا اور بولے:

''میں بھی چلتا ہوں۔ باتوں باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ ادریس بھائی آپ کو حسب وعدہ کال کر دیں گے انشااللہ''۔

مصافحہ کے بعد وہ دنوں رخصت ہو گئے۔

دوسرے دن شام میں دوست کو ادریس بھائی کا فون آیا کہ میری جاب کا بندوست ہو گیا ہے اور رائیڈ کا بھی۔

اگلی صبح 7.30 پر تیار رہنے کا کہا گیا تھا کہ ایک گاڑی لینے آئے گی اور جاب پر اتارے گی۔ اس کے صرف دو ڈالر دینا ہوں گے کیونکہ یہ رائیڈ شیئرنگ ہے۔

یہ ایک ویئر ہاؤس میں لیبر جاب تھی۔ جہاں پر کرٹین/ پردوں کے راڈ اور تنصیب کے متعلقہ ساز و سامان سپلائی کے آرڈر لیے اور پیکنگ کر کے روانہ کیے جاتے تھے۔ ویئر ہاؤس کی خاتون سپروائزر ٹریسی سے میرا تعارف نئے ورکر کے طور پر کرایا گیا۔ دو اور لوگ بھی تھے جو نئے نئے کینیڈا آئے تھے۔ سپروائزر نے مجھے بتا دیا کہ سینئر ورکر آڈر کی چیزیں اکٹھی کرتے ہیں اور آپ نے ان کی ہدایات پر ڈبوں میں پیکنگ کرنا ہوگی۔

مختلف خانوں سے سامان کو ایک جگہ پر اکٹھا کرنے کے بعد ان کی پیکنگ کا عمل ہی دراصل یہاں ہونے والا کام تھا۔

جب آپ کسی کام پر نئے ہوں اور کام سیکھنے جا رہے ہوں تو وہ تھکا دینے والا اور بور بھی ہوتا ہے۔ وہی کام جب آپ سیکھ لیتے ہیں اور اس کے عادی ہو جاتے ہیں تو پھر مشکل کام آسان ہو جاتا ہے۔ پہلا دن سوچوں میں کام کرتے گزرا تو شکر ادا کیا لیکن جسمانی اور ذہنی طور پر بہت تھکاوٹ ہوگئی۔ ایک تو ایسے کام کی عادت نہیں تھی دوسرا سوچا بھی نہیں تھا کہ کینیڈا جا کر ایسے کام سے ابتدا کرنا پڑے گی۔

دوسرے دن ویئر ہاؤس میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو کل کام پر نہیں تھے۔ لمبے لمبے بال، چھوٹی داڑھی اور مونچھیں رکھی تھیں۔ لمبا قد اور جسمانی طور پر فٹ تھے۔ ان سے ہیلو ہائے کر کے اپنے بارے میں بتایا:

''میں نیا نیا کینیڈا آیا ہوں اور یہ کام سیکھ رہا ہوں، ابھی میرا دوسرا دن ہے''

انہوں نے کہا:

''کوئی مسئلہ نہیں، میں کئی سال سے یہاں کام کر رہا ہوں اور یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے ورنہ کینیڈا میں بڑے بڑے مشکل کام انہوں نے کر رکھے ہیں''۔

کچھ چیزیں انہوں نے کام سے متعلق بتائیں اور اپنے ساتھ عملی طور پر کام کر کے بتایا کہ یہ اس طریقے سے زیادہ آسانی سے پیک ہو سکتا ہے۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہ دوسری طرف اپنے کام کے سلسلے میں نکل گئے۔

بریک کے دوران ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ وہ جب اچھے موڈ میں تھے کیونکہ میں نے نوٹ کیا تھا وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے تھے۔

کینیڈا میں کام کا ماحول یہ بھی ہے کہ آپ اپنے کام پر توجہ دیں اور ایک دوسرے سے غیر ضروری بات نہ کریں اور آپ کی ایسی باتوں کو سپروائزر گاہے بہ گاہے چیک کرتے رہتے ہیں۔

ان کا نام سنی پٹیل اور ہندوستان سے تعلق تھا۔ میں نے پوچھا

''آپ کینیڈا کب آئے تھے کچھ بتائیں؟''

کہنے لگے:

''میں مونٹریال اولمپکس جو 1976 میں کینیڈا میں ہوئے تھے دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ میرا ایک بھائی جو پہلے ہی کینیڈا رہتا تھا اس نے مجھے کہا:

یہ اچھا موقعہ ہے، تم اولمپکس دیکھنے کے لیے ٹوریسٹ ویزا اپلائی کرو۔ مل جائے گا''۔

ایسا ہی ہوا میں نے ویزا اپلائی کیا جو لگ گیا۔ میں کینیڈا پہنچ گیا۔ بھائی نے مجھے کہا کہ تم یہیں رک جاؤ۔ میں نے اس کا کہنا مانا اور کینیڈا میں ہی پناہ گزین ہو گیا۔ چند سالوں بعد مجھے پیپر بھی مل گئے۔ نوجوان تھا کام کر کے میں نے اچھی خاصی رقم بھی جمع کر لی تھی۔ میں واپس انڈیا چلا گیا اور والدین کے پاس جا کر میں نے کہا:

''اب میں اکیلا کینیڈا میں نہیں رہ سکتا''۔

انہوں نے پوچھا کیا چاہتے ہو؟

''میری شادی کروا دو کیا''۔

میں نے دوٹوک انداز میں بتا دیا:

والدین نے میرے لیے لڑکی ڈھونڈ کر شادی کروا دی اور میں واپس کینیڈا آ

کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

فیکٹری کی جاب کے ساتھ ساتھ میں نے ہینڈی مین کا ایک کورس کر لیا تھا تا کہ بیوی کے آنے سے پہلے میں کوئی اپنی جاب کا الگ سے بندوبست کر سکوں اور گھر کو بھی ٹائم دے سکوں۔

اب میں سرٹیفائیڈ ہینڈی مین کے طور پر ایک ریگولر جاب کئی سالوں سے کر رہا ہوں۔ جب میرے پاس وہاں سے چھٹی ہوتی ہے تو میں اس ویئر ہاؤس میں بھی کام کر لیتا ہوں۔

یہاں کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میں فارغ نہیں بیٹھتا۔ کینیڈا میں دہائیوں سے رہتے ہوئے یہ عادت ہو گئی ہے کہ فارغ بیٹھنے سے طبیعت بے چین ہو جاتی ہے۔ اس لیے خود کو مصروف رکھنے کے لیے بھی اس طرح کے پارٹ ٹائم کام بھی چھوڑ نہیں سکتے''۔

پٹیل نے اصل بات بتا دی کہ اس کے مسلسل کام کے پیچھے کیا فلاسفی ہے

اپنی فیملی کے بارے میں پٹیل نے بتایا کہ اس کا ایک بیٹا اور بیٹی ہے اور اس کی بیوی بھی کام کرتی ہے۔ ہم نے ایک بڑا گھر لے رکھا ہے جو تقریباً پیڈ آف ہے۔

پٹیل میری طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''کینیڈا میں گھر کا نظام چلانے کے لیے سب کو یہاں کام کرنا پڑتا ہے۔ کوئی اور چوائس نہیں ہے' اگر آپ ایک دن کام نہیں کریں تو اس دن کی کمائی سرکل سے نکلنے سے آپ کی پریشانی بڑھ جاتی ہے''۔

پٹیل سنجیدہ سا لگ رہا تھا اور کہنے لگا:

''سچ بتاؤں کہ میں یہاں کام کر کر کے بعض اوقات ذہنی طور پر اتنا تنگ آ جاتا ہوں کہ میں چڑچڑا سا ہو جاتا ہوں۔ میرا دل کرتا ہے میں یہاں سے کہیں اور بھاگ جاؤں''۔

پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا:

''آپ چونکہ ابھی کینیڈا میں نئے آئے ہو اس لیے آپ کو یہاں کے سخت کام اور بظاہر آسان مگر کٹھن زندگی کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ آپ کو وقت گزارنے کے بعد پتہ چلے گا کہ یہاں کس قسم کے مسائل کا سامنا ہوتا ہے اور کس بھاؤ بکتی ہے۔ روزانہ کام پر نکلنا بھلے شدید سردی ہو یا برفباری آپ کی مجبوری ہے۔

بہت سٹریس ہے بھئی یہاں کے ماحول اور کام میں''۔

پٹیل بڑبڑایا۔ پٹیل نے پھر مجھ سے بچوں کے بارے پوچھا تو میں نے بتایا کہ بچے ابھی چھوٹے ہیں۔

''میرے بچے تو بڑے ہو گئے رہتے تو ہمارے ساتھ ہی ہیں۔ ان کو شادی کرنے کا کہتا ہوں تو ٹال جاتے ہیں۔ پتہ نہیں یہاں کے بچوں کو کیا ہوا ہے۔ ماں باپ کا کہنا ہی نہیں مانتے۔ میں نے بھی تنگ آ کر ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ جہنم میں جائیں''۔

پٹیل یہ بتاتے ہوئے بچوں کو کوسنے لگ گیا۔

پٹیل خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولا:

''آپ یقین کریں کام، ماحول اور بیوی بچوں کے رویوں سے ذہنی طور پر اس قدر تنگ آ جاتا ہے کہ کبھی کبھار اکیلے میں بیٹھ کر اپنے بھائی کو برا بھلا کہتا ہے۔ کوستا بھی ہے کہ اس نے مجھے کیوں بلایا، مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا''۔

پٹیل قدرے توقف کے بعد گویا ہوا:

''اصل بات یہ ہے کہ بچے یہاں پیدا ہوئے ہیں ان کا بھی قصور نہیں ہے۔ یہاں کے ماحول کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں جبکہ ہم جہاں پیدا ہوئے ہیں

ہم وہاں کی مٹی سے جڑے ہوئے ہیں۔ کینیڈا میں کام بھی ہے، دولت بھی ہے لیکن میرے جیسے بندے کے لیے یہاں سکون نہیں ہے اور میں نے اپنی بیوی سے کہہ رکھا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہم نے اپنی جوانی کینیڈا میں گزار دی لیکن بڑھاپا تو کم از کم ہندوستان میں جا کر سکون سے گزاریں''۔

پٹیل کی باتیں اب مجھے پریشان کر رہی تھیں مگر یوں لگتا تھا کہ میں نے اسے چھیڑ دیا ہے تو وہ سب کچھ بتا دینا چاہتا ہے۔

وہ پلٹ کر بولا:

''میں نے دیکھا ہے کہ کینیڈا میں اولاد بھی آپ کے کام نہیں آتی اور آپ کو اولڈ ہومز میں رہنے کے لیے بھیج دیا جاتا ہے جو ایک قید خانہ ہوتا ہے اور مجھے اس سے بہت خوف آتا ہے''۔

پٹیل نے بتایا کہ اس کے والد کینیڈا کی زندگی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ ایک دفعہ کینیڈا آئے تو جیسے ہی ایئرپورٹ سے اترے۔ انہوں نے دیکھا کہ گاڑی میں سٹیرنگ الٹی سائیڈ پہ لگا ہوا ہے۔ جب گھر میں داخل ہوئے تو دروازہ بھی الٹی سائیڈ کا کھل رہا تھا۔ انہوں نے گھر لائٹ جلائی تو وہ بھی الٹی سائیڈ کو آن آف ہو رہی تھی۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ یار کس الٹے پلٹے ملک میں تم لوگ آ کر رہ رہے ہو، یہ کوئی رہنے کے قابل ملک ہے؟

ایک بار وزٹ پر آنے کے بعد دوبارہ کینیڈا کبھی نہیں آئے۔ میرے والد صاحب جب کینیڈا آئے تھے تو ہم ان کو ایک پارک میں لے کر گئے جہاں ہماری پٹیل برادری کا کوئی اکٹھ اور پکنک چل رہی تھی۔ وہاں کسی کو پیشاب آ گیا۔ اتفاق سے وہاں باتھ روم بھی نہیں تھے۔ ایک شخص نے وہاں جا کر جھاڑیوں کی اوٹ میں پیشاب کیا تو اسے پارکنگ انسپکٹر نے پکڑ کر جرمانہ کر دیا کہ اس نے پارک میں قوانین کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس

پر ہمارے والد نے بہت کلاس لی اور بے عزت کیا۔

پٹیل کی یہ باتیں میرے لیے دلچسپ مگر ان کی زندگی کا نچوڑ تھیں، ابھی شاید وہ کچھ اور بھی گوشوں سے پردہ اٹھاتے لیکن ہماری بریک کا ٹائم ختم ہو گیا تھا۔

سنی پٹیل مجھے یہ کہہ کر اندر کی طرف چل دیے

''آپ کو میری ان باتوں کی صداقت کا اندازہ آنے والے دنوں میں ہو جائے گا کہ کینیڈا میں کیا زندگی ہے''۔

...11

کینیڈا میں پنجابی سکھ بہت بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ان کی آبادی لاکھوں میں ہےاور مسلسل بڑھتی چلی جارہی ہے۔

سکھوں کو کینیڈا میں آباد ہوئے سو سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہے۔ ویسے تو پہلی بار ایک سکھ گروپ کینیڈا میں 1904 میں آیا تھا' لیکن 1914 میں ہندوستان سے ایک بحری جہاز ساؤتھ ایشین باشندوں سے بھرا کینیڈا آیا جن میں اکثریت سکھوں کی تھی اس کو لنگر انداز نہیں ہونے دیا گیا تھا۔اسے زبردستی کینیڈا کے ساحل سمندر سے چلتا کیا گیا تھا۔سکھ پناہ گزینوں نے ہمت نہیں ہاری اور کوشش کرتے رہے' بالآخر کینیڈا کے حکام نے انہیں قیام کی اجازت دے دی۔ یوں بعض خاندان کئی نسلوں سے کینیڈا میں آباد ہیں۔

پنجابی سکھ کینیڈا میں کاروبار،کھیتی باڑی اور سیاست میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔کینیڈا کی پارلیمنٹ میں سکھ معقول تعداد میں ممبرز ہیں۔ ہر سیاسی پارٹی میں پنجابی سکھ موجود ہیں بلکہ کینیڈا کی پارلیمنٹ میں تیسری بڑی پارٹی این ڈی پی کے حالیہ لیڈر جگمیت سنگھ پنجابی سکھ ہیں جو کینیڈا میں پیدا ہوئے۔

کینیڈا میں سکھوں کے نام پکارنے میں بڑے دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ان کے اصل نام تو کچھ اور ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے ''نک نیم'' سے ایک دوسرے کو بلاتے اور مشہور ہونا پسند کرتے ہیں۔

ایسے مقبول ناموں میں بوبی، ہیپی تیجا، چھینا،منٹو، لکھو،جیتا، ڈیو، چمکور، گنڈو، بندر،،شمی،وکی،نکو،تکھڑ، برار، مان،جگی، گیٹا اور چھندا وغیرہ شامل ہیں۔

سکھ ایک دوسرے کو بھائی اور ویرا کہہ کر بلاتے ہیں۔ کینیڈا میں بعض اوقات کچھ ایسے گورے مل جاتے ہیں جو دیکھتے ہی ست سری آکال کہتے ہیں تو ان کو بتانا پڑتا ہے کہ یہ بھارتی پنجاب کی گریٹنگ ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستانی پنجاب میں سلام بلاتے ہیں' کئی ایسے پنجابی سکھ ہیں جنہوں نے گوروں کو اپنی گالیاں اور برے الفاظ ازبر کروا دیے ہیں۔ یہ گورے موقع مناسبت کے بغیر ہی دیسی شکل وشبہات کا کوئی بندہ مل جائے تو یہ الفاظ بول کر ثابت کرتے ہیں کہ انہیں بھی پنجابی زبان کے کچھ لفظ یا محاورات بولنے آتے ہیں۔ یہ ان کے لیے فن ہوتا ہے کہ جواب میں کس طرح کا ردعمل آئے گا کیونکہ ان کو بتایا ہی اس طرح گیا ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں گالی دینا یا برے الفاظ بولنا ''فن'' ہے۔

کینیڈا میں میرے بھائی کے ایسے ہی ایک پنجابی دوست کا نام بوبی تھا اور وہ اکھڑ مزاج نوجوان تھا۔ اس کی کمیونٹی گروپس میں اکثر لڑائی مار کٹائی کی کہانیوں کا چرچا بھی تھا۔ بھارتی پنجاب میں سکھوں کی اکثریت گوشت جن میں چکن بھی شامل ہے کھانے سے پرہیز کرتی ہے اور اپنے لیے اس کو منع کیا ہوا ہے بلکہ سبزی خور مشہور ہیں۔ ایسے میں میرے بھائی کے دوستوں کے گروپ نے باربی کیو کا اہتمام کیا تو بوبی سمیت ایک دو اور پنجابی سکھوں کو بھی پہلی بار مدعو کر لیا۔ جب باربی کی خوشبو اور دوسروں کو کھاتا دیکھا تو ان سے نہیں رہا گیا اور انہوں نے بھی چکن تکہ کھایا تو ان کو بہت اچھا لگا۔ اس پر بوبی کہنے لگا:

''یار ہمیں زندگی بھر پتہ ہی نہیں چلا کہ کھانے کا یہ ذائقہ بھی ہمارے ملکوں میں ہوتا ہے''۔

اس کے بعد جب کبھی موقع ملتا وہ بھی باربی کیو کی خواہش کے ساتھ پاکستانی دوستوں کی دعوت میں شریک ہو جاتا تھا۔

بوبی نے دیگر نوجوان سکھوں کی طرح داڑھی رکھی تھی اور سر پر پگڑی باندھا کرتا تھا۔ لمبی داڑھی رکھنے اور پگڑی باندھنے کا مطلب ہوتا ہے کہ آپ نے ''امرت چھک'' لیا ہے۔

اس کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ آپ بُرے کاموں سے توبہ تائب ہو کر نیک ہو گئے ہیں۔

بوبی سے ایک بار پوچھا گیا:

''گرمی کے دنوں میں آپ سارا دن پگڑی باندھے رکھتے ہیں تو ظاہر ہے پسینہ بھی آتا ہوگا اور پسینے سے تو بدبو پیدا ہوتی ہے''!

جواب میں بوبی کا کہنا تھا:

''بالکل ایسے ہی ہے۔ شام کو جب پگڑی اتارتے ہیں تو بالوں سے پسینے کی بدبو کے بھبوکے اٹھتے ہیں۔ وہ اس پر کبھی کبھی خود کو کوستا بھی ہے''۔

بوبی نہ صرف کھلی بات کرنے والا بلکہ لڑائی مار کٹائی میں دلیری بھی دکھانے والا تھا۔ اسی لیے اس کے دوست بوبی کو یاروں کا یار کہتے تھے۔ یہ تعریف سن کر بوبی کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔

بوبی نے بتایا کہ ایک محفل میں ان کی ہندوؤں سے بحث ہوگئی۔ جس میں موضوع یہ تھا کہ ہندوازم اور سکھ ازم کے بانی اور کرتا دھرتا کا کردار کیسا ہونا چاہیے؟

ہندوؤں کا الزام یہ تھا کہ سکھوں کے گرو نانک نے عام زندگی گزاری ہے اور شادی بھی کی جب کہ کسی بھی مذہب کے سب سے بڑے کو چاہے وہ عورت ہو یا مرد کو غیر معمولی زندگی اور کردار کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔

بوبی نے مزید بتایا کہ:

''اس طرح کا اعتراض ایک طرح سے ہمارے گروپ پر حملہ تھا۔ ہندوؤں نے جب یہ کہا کہ ان کی ماتا کو دیکھیں کہ اس نے مذہب کی سیوا کرنے کے لیے شادی نہیں کی اور پیروکاروں کی خاطر اپنی خواہشات کی پروا نہیں کی''۔

بوبی کہنے لگا:

''ہم سب اس بات پر پریشان تھے کہ اس چوٹ کا کیا جواب دیا جائے''۔

اچانک ہمارے گروپ کا ایک سردار بولا:

''دس بارہ تو ہاتھ تھے آپ کی متا کے جیسا کہ اس کی تصویروں میں دکھائے جاتے ہیں تو ایسی عورت سے شادی کون کرتا؟''

اس بات پر ہندو دوست لاجواب ہو گئے اور ان کو بڑا غصہ آیا۔ ہمارے گروپ کے دوسرے بندے نے منہ ماری بھی کر دی یعنی غیر ارادی طور پر گالی دے دی۔ بس پھر کیا تھا۔ لڑائی مار کٹائی شروع ہوگئی اور بات پولیس تک پہنچی تو بڑوں کی ضمانت پر صلح صفائی سے معاملہ ختم ہوا۔

ایک محفل میں بیٹھے بوبی سے پوچھا کہ آپ کب سے کینیڈا میں ہیں؟

''میں بچپن سے ہی اپنے والدین کے ساتھ یہاں آ گیا تھا اور کینیڈا میں سکول جانا شروع کیا تھا۔ جوان ہوئے اور یہیں پہ مختلف کام بھی کیے ہیں''۔

بوبی بچپن کے بارے میں بتانے کے بعد پھر گویا ہوئے

''آج کل ٹیکسی چلا رہا ہوں لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ کینیڈا میں رنگ و نسل کی بنیاد پر نسلی امتیاز اور تعصب اس قدر زیادہ ہے کہ میں اس سے تنگ آ چکا ہوں''۔

ٹیکسی چلانے کے دوران اسے خوب اندازہ ہوا کہ گورے ہمیں پسند نہیں کرتے اور دل میں نفرت رکھتے ہیں۔ انہیں تکلیف ہے کہ ہم لوگ یہاں کیوں آئے ہیں۔ چاہے کوئی بوڑھی عورت ہو یا مرد جہاں کہیں موقع ملتا ہے وہ نسلی تعصب کا اظہار کرنے سے باز نہیں آتے۔

بوبی کے لہجے میں یقین اور دکھ تھا۔

جب اس سے سوال کیا کہ وہ اس کا اظہار کیسے کرتے ہیں تو بوبی نے بتایا:

''گرمیوں کے دن تھے۔ ٹیکسی میں ایک بوڑھی عورت بیٹھی مجھ سے کہنے لگی:''

''آج بہت زیادہ گرمی ہے''۔

میں نے جواباً کہا:

''ہاں ہے''۔

پھر وہ بولی:

''تمہارے لیے تو گرمی بہت اچھی ہے، گڈ فار یو''۔

مجھے اس بات سے لگا کہ یہ مجھ پر طنز کر رہی ہے۔

میں نے اس سے کہا:

''یہ گرمی میرے لیے اچھی ہے اور تمہارے لیے کیوں نہیں ہے۔ میرا جسم کیا لوہے کا ہے؟''

اس پر خاتون کو کوئی جواب بن نہ پڑا اور وہ خاموش ہو گئی۔

اس کو یہ بات میں نے غصے میں کی تھی۔ اس نے بعد میں کمپنی مینجر کو میری شکایت کر دی کہ میں نے اس سے بدتمیزی کی ہے۔

اس پر مجھے دفتر جا کر بتانا پڑا کہ یہ بات ہوئی تھی، لیکن وہاں بھی ہمارے دیسی لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کا کہنا تھا:

''کسٹمر از آل ویز رائٹ''۔

اس لیے وہ کچھ بھی کہے آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ انہوں نے مجھے وارننگ دے دی کہ آئندہ ایسی شکایت پر آپ کو جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔

بولی نے بڑے دکھ سے کہا:

''یہ تو حال ہے یہاں کہ آپ کو بولنے بھی نہیں دیتے، چاہے اگلا بندہ آپ کی بے عزتی کر رہا ہو''۔

بوبی کچھ سوچتے ہوئے بولا:

''میں آپ کو ایک اور واقعہ سناتا ہوں۔ ایک گورا میری ٹیکسی میں ایئر پورٹ جا رہا تھا''۔

اچانک اس نے سوال کیا

''تم کہاں پیدا ہوئے؟''

میں نے بتایا:

''میں بچپن سے یہیں ہوں''۔

کہنے لگا:

''تمہارے والد کہاں سے آئے تھے؟''

میں سمجھ گیا کہ یہ کیا چاہتا ہے؟

میں نے جواب میں کہا:

''اپنے والد کو میں نے شروع سے یہیں پر دیکھا ہے''۔

اس پر رکا نہیں اور کہنے لگا:

''پھر تمہارے دادا کہاں سے آئے تھے؟''

یہ سننا تھا کہ مجھے غصہ آ گیا اور بولا کچھ نہیں۔ میں نے گاڑی کو یوٹرن بنانے کے لیے جب موڑا تو وہ چلایا:

''کیا کر رہے ہو، کدھر جا رہے ہو؟''

میں نے کہا:

''میں اپنے والد سے پوچھنے جا رہا ہوں تا کہ آپ کو بتا سکوں کہ وہ اور اس کا باپ کہاں سے آئے تھے؟''

اس پر گورے کو احساس ہو گیا کہ میں نے اس کے ذاتی سوالات کا برا منایا ہے۔

وہ معذرت کرنے لگا اور کہا:

''میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔تم تو سیریس ہی ہو گئے' پلیز سیدھے چلو اور مجھے ایئر پورٹ چھوڑ دو''۔

بوبی غصے کا تیز اور بات سیدھی کرتا تھا۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ صاف بات کرنے والا

بندہ غصے کا تیز ہوتا ہے کیونکہ وہ دل میں بات نہیں رکھتا۔

کینیڈا کے مقامی افراد جنہیں فرسٹ نیشن یا نیٹو بھی کہا جاتا اس کے بارے میں بوبی کہنے لگا:

''یہ جب بھی ٹیکسی میں بیٹھتے ہیں۔ بہت بک بک کرتے ہیں۔ جب کبھی شراب میں دھت ہوں تو عجیب وغریب سوال کرتے ہیں' اگر جوب نہ دو یا ان کی مرضی کا رسپانس نہ آئے تو بولنا شروع ہوجاتے ہیں

''یہ ہمارا ملک ہے۔تم لوگ یہاں آکر ہمارے وسائل پر قابض ہو گئے ہو۔ گو بیک ٹو یور کنٹری۔(اپنے ملک واپس جاؤ)

میں تو اکثر ان سے بھڑ جاتا ہوں اور کہتا ہوں:

''اب کینیڈا تمہارا ملک نہیں ہے۔ یہ سب کا ہے۔ پوری دنیا سے آئے لوگوں کا ہے۔ ہم لوگ یہاں کام کرتے ہیں' تمہاری طرح گورنمنٹ کی امداد پر نہیں پل رہے' اگر تم کام کرنے کے قابل ہوتے تو حکومت کو ہمیں یہاں بلانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی''۔

بوبی نے اپنا ایک اور واقعہ شیئر کرتے ہوئے بتایا

''رات کو لڑکوں کے ایک گروپ کو ٹیکسی میں بٹھا کر جارہا تھا کہ ایک نے مجھے دیسی پنجابی کے طور پر ہوٹنگ شروع کر دی' کچھ ایسے فقرے بولے کہ میرا میٹر گھوم گیا۔

میں نے گاڑی وہیں روکی اور ان کو کہا:

''نیچے اتر جاؤ میں تمہیں لے کر ہی نہیں جاؤں گا''۔

وہ نیچے اتر گئے اور گاڑی کے ٹرنک میں ان کے بیر کا ڈبہ پڑا تھا جو میں نے اٹھا کر غصے میں باہر پھینک دیا۔ بیئر پھینکنے پر انہیں بھی غصہ آیا کیونکہ یہ ایسے لوگوں کے لیے بہت بے عزتی کی بات ہوتی ہے کہ ان کی شراب کو اس طرح پھینک دیا جائے۔ ایک لڑکے نے میرے اوپر حملہ کر دیا اور مجھے مکے مارے تو جواب میں' میں نے بھی ہاتھا پائی کی۔ وہ

گالم گلوچ کرتے ہوئے اپنے بیئر اٹھانے کو لپکے تو میں وہاں سے گاڑی لے کر نکل گیا۔ میں تھوڑی دور گیا تو مجھے خیال آیا کہ میں نے غلط کیا ہے۔

ٹیکسی کے قانون کے مطابق آپ کسی بھی مسافر کو راستے میں اتار نہیں سکتے۔ ایک دفعہ جب مسافر آپ کی گاڑی میں بیٹھ جائے تو آپ نے اس کو ہر حال میں اس کی منزل تک پہنچانا ہوتا ہے۔ جب کہ میں نے ان کو راستے میں ہی اتار دیا تھا۔ دوسرا میں نے ان کے ساتھ ہاتھا پائی اور مار کٹائی کی تھی۔

اگر وہ میری شکایت کرتے تو میرے پاس اپنے دفاع میں کچھ دلائل نہ ہوتے کیونکہ محض کسی کے جملہ بازی پر ڈرائیور کا غصے میں آنا کمپنی کے لیے قابل قبول نہیں۔ اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ پہلے ہی پولیس اور کمپنی کو اس واقعہ کے بارے میں رپورٹ کروں۔ کمپنی کے دفتر میں فون کر کے میں نے بتا دیا کہ میرے ساتھ اس طرح کا واقعہ ہوا ہے اور میں پولیس کو بھی اس بارے مطلع کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنا کام چھوڑا اور گاڑی لے کر پولیس ہیڈ کوارٹر چلا گیا اور وہاں موجود آفیسر کو بتایا:

''میرے ساتھ یہ واقعہ ہوا ہے اور تین چار لوگوں نے مجھے زدوکوب کیا ہے۔ اس طرح سے مجھے تشدد کا نشانہ بھی بنایا ہے۔ پولیس والے نے میری بات سنی اور جواب میں کہا:

''آپ لوگ تو بے عزتی کروانے کے عادی ہو چکے ہیں۔ آپ یہاں آ کر اور اس طرح کی رپورٹ کروا کر خوامخواہ اپنا وقت ضائع کرو گے''۔

میں نے پولیس والے سے پوچھا:

''آر یو سیریس؟''

اس نے جواب میں کہا:

''میں آپ کو صحیح بتا رہا ہوں۔ اس واقعے پر کوئی کارروائی نہیں بنتی اور تم خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کرو گے، جا کے کام کرو اور پیسے بناؤ''۔

بوبی اس بات پر بہت زیادہ دکھی ہوا اور کہنے لگا:

''یہ تو اوقات ہے ہماری اس ملک میں کہ ہم تیسرے درجے کے شہری ہیں اور گورے ہمیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے''۔

ہمیں بات کرتے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی تو وہ کھڑا ہوا اور کہنے لگا:

''میں آپ کو اپنے دل کی بات بتاؤں اتنے سال یہاں گزارنے کے بعد اور یہاں لوگوں کے برتاؤ اور رویوں سے میں اتنا تنگ آ گیا کہ میرا دل کرتا ہے کہ میں یہاں سے کہیں اور بھاگ جاؤں''۔

یہ کہہ کر وہ چل دیا ہے اور میں سوچ میں پڑ گیا۔

کیا بوبی واقعی سچ کہتا ہے یا یہ صرف اس کے ساتھ ہونے والے واقعات سے کشید ذاتی سوچ ہے۔ وہ سچا اور کھرا آدمی تو بہر حال ہے۔

...12

میرے باپ نے جب مجھ سے یہ کہا:

''تم اس شخص سے گرل فرینڈ کے طور پہ ملو گی اور اس کو یہ شائبہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ تم پہلی بار رابطے میں آئی ہو''۔

میں گھبرا گئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

ابھی میں سنبھل نہیں پائی تھی کہ میرا باپ رعب سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا:

''اور ہاں کوئی ایسی غلطی نہیں کرنی جس سے اس کو کوئی شک گزرے کہ تم کوئی اور لڑکی ہو، ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا''۔

یقین کریں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میرا باپ یہ کیا بات کر رہا ہے اور کیا چاہتا ہے؟ میرے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ میں کسی ایسے شخص کو مل رہی ہوں جو میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔

شیری کا تعلق فلپائن سے تھا اور ہماری اس کلاس فیلو کی کہانی کچھ زیادہ ہی دلچسپ تھی۔

شیری کہنے لگی:

''جب میں نے باپ کی بات نہ سمجھتے ہوئے انکار کیا کہ میں جس شخص کو کبھی ملی نہیں اس کو میں کیسے گرل فرینڈ کے طور پہ مل کر یہ ثابت کروں کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں''۔

میرے باپ نے مجھے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور میرے آنسو نکل آئے۔

اس دوران میری بڑی بہن درمیان میں آئی تو میرے باپ نے اس کو گرج کر کہا:

''اس کو سمجھاؤ، میں اس کے بہتر مستقبل کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہوں''۔

بالآخر مجھے اپنے باپ اور بہن کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور میں نے حامی بھر لی کہ میں اس شخص سے اس طرح ملنے کی کوشش کروں گی کہ میں ہی اس سے رابطے میں تھی اور میں ہر بات جانتی ہوں۔

تفصیل بتاتے ہوئے شیری نے کہا:

''دراصل میرا باپ کینیڈا میں ایک 35 سالہ شخص کے ساتھ خط و کتابت کر رہا تھا اور اس نے میری تصویر بھیج کر دوستی اور محبت میں مبتلا ظاہر کیا تھا''۔

بعد میں میرے باپ نے مجھے بتایا کہ وہ چھ ماہ تک اس فلپینو کینیڈین کے ساتھ میرے نام سے لڑکی بن کر خط و کتابت کرتا رہا' بالآخر اسے قائل کر لیا کہ وہ فلپائن آ کر مجھ سے ملے تا کہ ہماری شادی ہو سکے۔

کل وہ شخص میکڈونلڈ پر ملنے کے لیے آنے والا تھا اور میں نے اس سے خط و کتابت کے دوران ہونے والی دوستی اور محبت کو ثابت کرنا تھا۔

مجھے دیکھنے اور ملنے کے بعد اس نے شادی کا وعدہ بھی کیا ہوا تھا۔ ریمنڈ نامی یہ شخص مجھ سے عمر میں 13 سال بڑا تھا' لیکن اس نے کسی وجہ سے اپنی شادی نہ ہونے کا بتایا تھا۔ مجھے یہ ذہن میں بھی رکھنا تھا اور اس بارے میں کوئی سوال بھی نہیں کرنا۔

مقررہ وقت پر میں اپنے باپ کے ساتھ میکڈونلڈ گئی۔ میرے باپ نے مجھے اس کی تصویر دکھا دی تھی اور ساتھ میں مجھے وارننگ بھی دی تھی کہ جس طرح مجھے بتایا گیا ہے اسی طریقے سے چپ چاپ اس شخص کے ساتھ برتاؤ کرنا ہے کہ وہ مجھے شادی کر کے کینیڈا لے کر جانے میں کوئی تاخیر نہ کرے۔

میں بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا وہ شخص پہلے سے کونے میں ایک ٹیبل پر بیٹھا تھا۔

میں آہستہ سے چلتی ہوئی اس کے ٹیبل پر گئی اور اس کے سامنے چپکے سے بیٹھ گئی۔ مجھے چہرے پر مسکراہٹ سجانی تھی کیونکہ میرا باپ دور ایک ٹیبل پر بیٹھ کر ہم دونوں کو دیکھ

رہا تھا۔ میں اپنے باپ سے خوفزدہ بھی تھی۔ ریمنڈ نے مجھے مسکرا کر حال چال پوچھا اور اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا:

''تم حقیقت میں بہت خوبصورت ہو اور پہلی نظر میں اور بھی اچھی لگی ہو''۔

''ہم بہت جلد شادی کر لیں گے اور میں تمہیں کینیڈا لے جاؤں گا''۔

اس نے بلا تاخیر اپنا فیصلہ سنا دیا اور یہی میرا باپ چاہتا تھا۔

اس کے بعد اس نے پوچھا کہ تم کھانے میں کیا پسند کرو گی؟

میں نے کہا:

''جو آپ پسند کریں گے وہی میں کھا لوں گی''۔

تو اس نے کہا:

''مجھے برگر پسند ہے اور تمہارے لیے بھی برگر لے کر آتا ہوں''۔

جب وہ برگر لینے کاؤنٹر پہ گیا تو میں نے دیکھا کہ دور ٹیبل پر بیٹھے ہوئے میرے باپ نے میری طرف دیکھ کر تھم اَپ کیا اور ایک مسکراہٹ بھی دی۔

اس کا مطب تھا:

''تم ٹھیک جا رہی ہو''۔

میں نے دیکھا پہلی مرتبہ کوئی شخص برگر کا ریپر اتار کر کھانے سے پہلے پھینک رہا ہے۔ ریپر کے بغیر اس نے برگر کھانا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ ہم باتیں کرتے جاتے تھے۔ اصل میں فلپائن میں یہ رواج ہرگز نہیں ہے۔ جس ریپر میں برگر ہوگا اس کے اندر رکھ کر کھایا جاتا ہے' لیکن ریمنڈ کینیڈا میں پچھلے 20 سال سے رہنے کے بعد اس طرح برگر کھانے کا عادی ہوا تھا۔

مجھے اس بارے میں سوال کرنے کی ضرورت تھی نہ میں نے کوشش کی۔ اس کامیاب میٹنگ کے بعد طے یہ ہوا کہ وہ اپنے ہوٹل جائے گا اور میں اپنے باپ کے ساتھ اس کے بعد ہوٹل میں ملوں گی تاکہ شادی کے معاملات کو آگے بڑھایا جا سکے۔ شام

کو میرا باپ مجھے لے کر ہوٹل پہنچ گیا اور میں نے اپنے باپ کا تعارف ریمنڈ سے کروایا تو اس نے میرے باپ کو کہا:

''آپ کی بیٹی بہت خوبصورت ہے اور ذہین ہے کہ میرے ساتھ خطوط کے تبادلے میں اچھی اچھی باتیں کرتی رہی ہے اور اس نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا''۔

''میں اس سے فوری شادی کرنا چاہتا ہوں اور اسے بہت پیار سے اپنی بیوی بنا کر پورا خیال رکھوں گا''۔

یہ کہہ کر ریمنڈ نے میرے باپ کو یقین دلا دیا۔

میرے باپ نے سب کچھ جاننے کے باوجود اس سے کچھ ایسے سوالات کیے کہ جیسے اسے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ ریمنڈ نے میرے والد کو اختیار دیا کہ آپ چرچ میں شادی کا اہتمام کریں اور اس کا تمام خرچہ وہ خود برداشت کرے گا۔ تاریخ طے ہوگئی اور شادی کے سارے معاملات مکمل ہو گئے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر میری شادی ریمنڈ سے انجام پا گئی۔

میں اس کے ساتھ ہوٹل میں کچھ دن رہی۔ اس کے بعد ہم نے ہنی مون پر بڑا بھرپور وقت گزارا اور تصویریں وغیرہ بنانے کے بعد ریمنڈ شادی کے دیگر ڈاکومنٹس لے کر کینیڈا روانہ ہوگیا۔ اس کے جانے پر میں اداس بھی ہوگئی تھی۔ طے یہ پایا کہ وہ واپس جا کر جلد سے جلد میرا کیس فائل کرے گا اور مجھے اپنی بیوی کے طور پر وہاں بلا لے گا۔ اس دوران مجھے ملنے کے لیے گاہے بہ گاہے فلپائن آتا رہے گا جب تک میرا کیس مکمل نہیں ہو جاتا۔ یہ سب کچھ میرے لیے نہ صرف خوشگوار حیرت کی بات تھی بلکہ ایک خواب سا معلوم ہوتا تھا اور مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میرا باپ میرے لیے یہ سب کچھ کرتا رہا ہے!

میں نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ باپ ہی وہ واحد ہستی ہوتی ہے جو اپنی اولاد کو کامیاب دیکھنا چاہتی ہے ورنہ باقی سب تو آپ کی کامیابی سے حسد میں مبتلا ہوتے ہیں۔

ریمنڈ اب جب مجھے خط لکھتا تو میں مذاق میں باپ کو کہتی:

''اس کا جواب آپ دیں یا مجھے بتائیں کہ کیا لکھوں کیونکہ آپ نے ہی یہ سب کچھ کیا ہے''۔

اس پر باپ کا جواب تھا کہ میں اپنے حصے کا کام کر چکا' آگے تم خود سنبھالو۔

باپ نے مجھے کہا:

''میں اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر تمہیں بتا رہا ہوں کہ مرد کو چھوٹی عمر کی عورت زیادہ پسند ہوتی ہے۔اس لیے تم اس نفسیات کا خوب فائدہ اٹھا سکتی ہو''۔

باپ کی اس بات کی مجھے زیادہ سمجھ نہیں آئی مگر ابھی تک میرے ذہن میں اٹکی ہوئی ہے۔

میں ریمنڈ کے ساتھ کینیڈا جانے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔تین ماہ میں میرا کیس پراسس ہو گیا تھا۔ریمنڈ نے اس دوران تین بار فلپائن آ کر مجھے خوب گھمایا پھیرایا۔جس طرح ایک نئے شادی شدہ جوڑے کو گھومنا اور اکٹھے ساتھ وقت گزارنا چاہیے۔

جب میں فلپائن سے کینیڈا جا رہی تھی تو میرے باپ نے بہت پیار کیا اور بہت ساری دعائیں دیں اور اب وہ کہہ رہا تھا:

''یہ شخص تم سے بڑا ہے اور تم نے اس کا زیادہ خیال رکھنا ہے۔اسی عمل سے تمہاری شادی کامیاب رہے گی''۔

میرے باپ نے ریمنڈ سے بھی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

''ہر باپ کو بیٹی بہت پیاری ہوتی ہے اور وہ کبھی نہیں چاہتا کہ اسے کوئی دکھ دے۔مجھے یقین ہے کہ تم میری بیٹی کو خوش رکھو گے۔تم لوگوں کو آنے والی شادی شدہ زندگی کے لیے ڈھیروں دعائیں دیتا ہوں''۔

یہ کہتے ہوئے میرے باپ کی آواز رندھ گئی اور میری بھی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

ریمنڈ کے ساتھ کینیڈا پہنچنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ کینیڈا میں میرے اندازے

سے کہیں زیادہ سردی پڑتی ہے۔ ریمنڈ کے پاس اپنا گھر اور گاڑی تھی۔ اس نے مجھے سمجھا دیا کہ کس طرح سے سردی سے بچاؤ کرنا ہے۔ ریمنڈ نے مجھے ڈرائیونگ لائسنس حاصل کرنے میں مدد کی اور پھر اس نے مجھے ایک کالج میں ایک ڈپلوما کورس میں داخلہ بھی لے کر دیا تا کہ مجھے یہاں کے ماحول میں رہ کر کام کرنے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔

کینیڈا آنے کے بعد میں اپنے باپ اور بہن کو بہت مس کرتی تھی اور اپنی مرحومہ ماں بھی بہت یاد آتی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ کینیڈا کی زندگی میں اکلاپا بہت زیادہ ہے جس سے ذہنی دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ ایسے میں ریمنڈ نے مجھے سپورٹ کیا اور میرا خیال رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

مجھے آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ ریمنڈ کو رات میں شراب پینے کی عادت بھی ہے۔ اس سے مجھے پریشانی لاحق ہوئی کیونکہ فلپائن میں شادی کے بعد جب ہم اکٹھے تھے تو اس نے اس عادت کو شو نہیں کیا تھا۔ شروع شروع میں تو میں خاموش رہی لیکن نشے کی حالت میں اس کی اوٹ پٹانگ حرکتوں نے مجھے خوف زدہ بھی کر دیا۔ اس کے باوجود مجھے اپنے باپ کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کے مطابق یہ سب کچھ برداشت کرنا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ صبح نارمل ہونے کے بعد ریمنڈ رات کی کسی بدتمیزی پر سوری کرنا نہیں بھولتا تھا۔ میں اس کی شراب نوشی کے بعد کی حالت پر احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ریمنڈ کی باتوں سے مجھے محسوس ہونا شروع ہوا کہ وہ مجھے باہر نکل کر کوئی جاب کروانے کے بھی حق میں نہیں ہے۔ زیادہ تر فلپائنی عورتیں کام کرتی ہیں چاہے وہ کینیڈا میں یا فلپائن میں۔ وہ ورکنگ لائف سٹائل کو پسند کرتی ہیں۔ اس کام کرنے پیچھے فلاسفی اور لائف سٹائل کے بارے شیری نے بتایا کہ:

''فلپائن میں نہ صرف بیٹے بلکہ بیٹیاں بھی ماں باپ کی مالی مدد کی ذمہ دار ہوتی ہیں''۔

ریمنڈ کا کہنا تھا:

''میری آمدنی سے ہم اچھے طریقے سے گزارا کر سکتے ہیں تو اسے کام کرنے
کی کیا ضرورت ہے؟''

میں اس دلیل پر چپ ہو جاتی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ مجھے یہ احساس ہوتا گیا کہ ریمنڈ مجھے قابو اور زیر اثر رکھنا چاہتا ہے۔ ہماری شادی شدہ زندگی کو اسی طرح 13 سال گزر گئے۔ میں نے اپنے باپ سے ریمنڈ کے بارے میں کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا تھا۔

وہ اس بارے میں مجھے پوچھتا بھی تھا تو میں ہمیشہ بات کو ٹال دیتی تھی۔ 13 سال میں ہمارے تین بچے جن میں دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی پیدا ہوئے۔ میں نے اپنی زیادہ توجہ بچوں پر مرکوز کر رکھی تھی۔ ریمنڈ کا رویہ کچھ اس انداز سے مختلف ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ توجہ اور وقت نہ دینے کا شکوہ کرتا رہتا تھا۔

اس کا کہنا تھا:

''میں بدل گئی ہوں اور اسے نظر انداز کر رہی ہوں جو اچھی بات نہیں''۔

''میں نے ریمنڈ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس کی سوچ ٹھیک نہیں ہے
میں بچوں میں زیادہ مصروف ہوتی ہے مگر وہ اسے بہانہ بازی سمجھتا رہا''۔

ریمنڈ کی بڑھتی ہوئی شراب نوشی کی وجہ سے میرے ساتھ وہ اونچی آواز میں بات کرنے سے بد کلامی تک چلا گیا۔ ریمنڈ کے اس رویے سے میں بہت پریشان ہوئی۔ سوچا باپ سے بات کروں مگر پھر رُک گئی کہ وہ دکھی ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ ریمنڈ نے غصے میں مجھ پر ہاتھ بھی اُٹھایا اور اس تشدد کے نتیجے میں بچے بہت سہمے رہنے لگے تھے۔ سال بھر کی اس اذیت ناک صورتحال کا سامنا کرنے کے بعد جب مجھے لگا کہ ریمنڈ کے رویے میں بہتری کا امکان نہیں تو میری ہمت بھی جواب دے گئی اور میں نے اس شخص سے علیحدگی حاصل کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔

مجھے اب کینیڈا کے قوانین کے بارے میں بھی آگاہی ہو گئی تھی کہ کوئی شخص کسی کو

زبردستی اپنے تعلق میں نہیں رکھ سکتا بھلے وہ شادی کا ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے اپنے کمیونٹی کے کچھ مخلص دوستوں کو حالات بتائے اور ان کے مشورہ سے قانونی طور پر علیحدگی اختیار کر لی۔

ریمنڈ نے بھی سارے عمل میں مجھے سنجیدگی سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے اپنے بچوں سے پوچھا کہ وہ کس کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو انہوں نے کہا: وہ اپنے باپ کے ساتھ ہرگز نہیں رہنا چاہتے۔ ہم نے اس گھر سے نکل کر علیحدہ رہائش اختیار کر لی اور بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی پڑھائی میں مصروفیت کے علاوہ ایک دفتر میں جاب بھی کرنے لگ گئی۔ چائلڈ ٹیکس کے طور پر گورنمنٹ سے کچھ رقم مل جاتی تھی اور میری جاب سے حاصل ہونے والی آمدنی سے ہمارے گھر کے اخراجات چل رہے تھے۔ اس کے علاوہ میرے سابق خاوند اور بچوں کے باپ ریمنڈ کی آمدنی سے بھی چائلڈ سپورٹ کی رقم قانونی طور پر ملتی تھی۔ عدالت کے حکم کے تحت بچوں کو اپنے باپ سے ملنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔

اس طرح ایک سال سے زائد عرصہ گزر گیا۔ ریمنڈ نے بچوں سے ذکر کیا کہ وہ میرے سے روا رکھے گئے رویے پر شرمندہ ہے اور اس نے شراب نوشی کی عادت پر قابو پا لیا ہے اور وہ ری یونین کرنا چاہتا ہے۔

میں نے اس بات کو قبول نہیں کیا اور جواب دیا:

''میں نے اس کے زیر اثر جو اذیت کی زندگی گزار لی ہے وہی کافی ہے۔

میں دوبارہ خود کو ایسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی''۔

میرے اس انکار پر بات ختم ہو گئی۔

وقت گزرتا گیا اور مجھے نارمل ہونے میں کچھ اور سال لگ گئے۔ بچے بھی کالج سے نکل کر اب یونیورسٹی جانے کی تیاریوں میں تھے کہ میری ملاقات چرچ کے ذریعے ایک فلپائنی شخص ہیری سے ہوئی جو پیشے کے اعتبار سے بس ڈرائیور تھا۔ وہ بھی سنگل تھا کیونکہ اس کی بیوی سے کچھ سال پہلے علیحدگی ہو چکی تھی۔ اس کے بھی تین بچے تھے جو اس کی

بیوی کے پاس رہ رہے تھے۔ چند مہینے ملاقاتوں کے بعد ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسری شادی سے پہلے ہم دونوں کو چرچ سے ایک سال تک کونسلنگ کی کلاسیں لینا تھیں۔ جس کے لیے ہم باقاعدگی سے جاتے رہے۔ چرچ کی کامیاب کلاسیں پوری ہونے کے بعد ہم دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

ہیری اچھی نیچر کا آدمی تھا لیکن وہ اپنی بیوی سے چوٹ کھائے ہوئے تھا۔ میں اپنے خاوند کے متشدد رویے سے تنگ تھی۔

ہیری نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی بیوی نے کسی اور شخص سے تعلقات بنا لیے تھے۔ اسے شک تھا لیکن بیوی نہیں مان رہی تھی۔ ایک دن اس نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو بیوی نے صاف کہہ دیا:

''وہ اس کے ساتھ مزید نہیں رہنا چاہتی اور دوسرے شخص کو پسند کرتی ہے''۔

یہ سن کر اس نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا اور اس کے بچوں نے ماں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ ہیری کا کہنا تھا' لیکن بچوں کے ماں کے ساتھ رہنے کے فیصلے کی وجہ سے وہ بے بس اور بہت زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار رہا کیونکہ وہ اپنے بچوں سے بہت زیادہ محبت و پیار کرتا تھا۔ ہم دونوں نے ملاقات کے بعد ایک دوسرے کا خیال رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ شیری نے اپنے نئے خاوند بارے میں بتایا کہ ہیری دوستانہ رویہ رکھتا ہے اور اسے معلوم ہوا کہ اس کی کمیونٹی میں ایسے بہت سے کیسز ہیں جن میں تشدد اور بے وفائی کی وجہ سے عورتوں اور مردوں کو الگ ہونا پڑا اور شادی والے گھر ٹوٹ گئے ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ نقصان بچوں کا ہوتا ہے جو ماں یا باپ کے پیار سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ایسے افسوسناک واقعات میں آپ کے بچوں کو کوئی اور پال رہا ہے آپ کسی اور کے بچوں کی ذمہ داری لے کر پھر رہے ہوتے ہیں' بعض اوقات یہ بڑی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ ایسے بچوں سے بڑے ہو کر اپنے لیے محبت اور وفا کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔

...13

امریکہ سے کینیڈا میں داخلے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں فرضی کہانی بنا کر بارڈر پر کینیڈا کے حکام سے پناہ کی درخواست کروں۔

میں پاکستان سے 10 لاکھ روپے دے کر ایک ایسا پاسپورٹ خرید کر ایجنٹ کے ذریعے امریکہ پہنچا تھا جس پر میری تصویر تبدیل کر دی گئی تھی۔قومی ایئر لائن کی فلائٹ کے ذریعے با آسانی نیو یارک پہنچ گیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایجنٹس، ایئر لائن، ایف آئی اے حکام کی ملی بھگت سے بے شمار لوگ امریکہ اور کینیڈا جاتے تھے اور پہنچنے پر ریفیو جی کلیم کر لیتے تھے۔ میں بھی انہیں میں سے ایک تھا۔

نیو یارک میں رہتے ہوئے مجھے دو ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک دن راستے میں مجھے کالے لڑکوں کے ایک گروپ نے گھیر لیا۔ رات کا وقت تھا اور میں وہاں سے بھاگ بھی نہیں سکا۔انہوں نے نہ صرف میرا والٹ چھین لیا بلکہ میری حسب توفیق ہر ایک نے پٹائی بھی کی۔

میں فٹ پاتھ پر نہ جانے کب تک بے ہوش پڑا رہا۔ایک بھارتی مسلمان ٹیکسی ڈرائیور نے ترس کھا کر مجھے اٹھایا اور ہسپتال لے گیا۔ جہاں میرا علاج معالجہ ہوا۔

اس واقعے کے بعد میرے اندر ایک خوف بیٹھ گیا تھا کہ امریکہ محفوظ نہیں ہے اور اگر دوبارہ یہ واقعہ ہوا تو میں کیا کروں گا۔ میں تو جان سے چلا جاؤں گا۔

مجھے اپنے لوگوں نے بتایا تھا کہ نیو یارک کے کچھ علاقوں میں ٹیکسی ڈرائیور سواری لے کر جانے سے انکار کر دیتے ہیں کہ ان کے ساتھ ڈکیتی اور مار کٹائی کا ممکنہ واقعہ ہو سکتا ہے۔

رات کے وقت سڑکوں پر ایسے کالے نوجوان گروپ راہگیروں کو روک کر ان کی تلاشی لیتے اور رقم نہ نکلنے پر اس لیے مارتے ہیں کہ اس نے جیب میں زیادہ رقم کیوں نہیں رکھی تھی۔

اسی شش و پنج اور خوف کے عالم میں کچھ دن گزرے تھے کہ مجھے ایک دوست نے مشورہ دیتے ہوئے کہا:

''امریکہ میں غیر قانونی طور پر رہ کر عدم تحفظ کا شکار ہو تو کینیڈا اس سے ہزار درجے بہتر ملک ہے تو وہاں ٹرائی کر لو''۔

میں نے یہ بات اپنے گھر والوں کو بھی نہیں بتائی تھی اور جن کے ساتھ رہتا تھا ان کو بھی منع کر دیا تھا کہ وہ میرے گھر والوں کو اس واقعے کے بارے میں نہ بتائیں ورنہ وہ سخت پریشان ہوں گے۔ میں انہیں ہرگز پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کوشش کے بعد مجھے ایک ایسا شخص ملا جس نے کینیڈا بارڈر تک پہنچنے کے لیے ساری رہنمائی کی۔ میں انجانے خوف میں بھی مبتلا تھا کہ پتہ نہیں میرے ساتھ کیا ہو سکتا ہے لیکن میرے دل میں تو اس واقعے کے بعد جو خوف بیٹھا تھا وہ مجھے چین نہیں لینے دیتا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ میں جلد از جلد کینیڈا چلا جاؤں۔ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اس ملک میں جان تو محفوظ ہے۔

بس میں بیٹھا اور کینیڈا کے بارڈر تک پہنچ گیا۔ امیگریشن حکام نے باقی لوگوں کے ساتھ مجھ سے بھی جب ڈاکومنٹس طلب کیے تو میں نے کہا: میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے مجھے ایک طرف بٹھا دیا گیا۔ وہاں بیٹھے طرح طرح کے وسوسوں نے گھیر رکھا تھا کہ کہیں واپس نہ بھیج دیں، پھر کیا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

گھنٹے بھر کے بعد خاتون آفیسر نے آ کر مجھ سے بات کی۔ میں نے اسے بتایا

''میں اچھا فیل نہیں کر رہا اور بات بھی نہیں کر سکتا''۔

اس نے کہا:

''کوئی بات نہیں''۔

پاکستان میں میری دفتر میں اچھی جاب تھی لیکن نامعلوم مجھے پاکستان سے باہر جانے کا شوق بے چین کیے رکھتا تھا۔ میں نے اسی مقصد کے لیے نہ صرف رقم جمع کی بلکہ کوشش بھی جاری رکھی اور غیر قانونی طریقے سے پاسپورٹ پر امریکہ جانے کی پیشکش کو قبول کر کے امریکہ پہنچ گیا۔ امریکہ میں مجھے ایک سٹور پر جاب ملی تھی اور میں وہاں اپنے آپ کو ابھی ایڈجسٹ کرنے کی کوشش میں تھا کہ میرے ساتھ تشدد اور ڈکیتی کا واقعہ ہو گیا۔ میں بددل ہو کر نکلا اور آج کینیڈا کے بارڈر پر حکام کے انٹرویو کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔ کینیڈین بارڈر سکیورٹی کی اس خاتون آفیسر کے دوستانہ رویّہ سے مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ امریکی جارحانہ جب کہ کینیڈین دوستانہ رویے کے حامل لوگ ہیں۔ وہ خاتون آفیسر دوبارہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی:

''آپ سے انٹرویو میں بعد میں کروں گی لیکن مجھے آپ کی ہیلپ درکار ہے کیونکہ میرے آفس میں ایک یہ ایسا شخص بیٹھا ہے جو عجیب وغریب کہانی سنا رہا ہے۔ اس کی مجھے کوئی سمجھ نہیں لیکن وہ بضد ہے کہ ایسا ہی ہوتا ہے''۔

میں اس کے ساتھ اندر چلا گیا دیکھا تو وہاں ایک افریقی نوجوان بیٹھا تھا۔ جو 30 سے 35 سال عمر کا تھا۔ خاتون آفیسر نے مجھے بتایا:

''یہ شخص افریقہ سے تین سال پہلے امریکہ آیا تھا اور اب یہ کینیڈا میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ یہ مجھے بتا رہا ہے جب وہ امریکہ میں آیا تھا تو اس نے وہاں سٹیٹمنٹ میں بتایا تھا کہ اس کا کوئی بچہ نہیں ہے۔ اب یہ کہہ رہا ہے اس کا ایک بچہ بھی ہے حالانکہ یہ افریقہ اپنی بیوی کے پاس واپس بھی نہیں گیا۔ امریکہ میں سٹیٹ منٹ میں اس کا کہنا یہ ہے کہ جب وہ اپنے ملک سے نکلا تھا اس کی بیوی حاملہ تھی اور ابھی چھ ماہ قبل اس کا بچہ پیدا ہوا ہے۔ میں اس سے پوچھ رہی ہوں کہ یا تو تم مانو کہ تم واپس اپنے ملک گئے تھے یا تم

جھوٹ بول رہے ہو، ممکن ہی نہیں کہ تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے ہاں بچہ بھی پیدا ہو چکا ہے''۔

لیکن یہ مصر ہے کہ بچہ اسی کا ہے اور یہ اس کی عجیب دلیل دے رہا ہے۔

میں نے اس سے یہ کہا کہ نو ماہ میں بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہارے ہاں تین سال میں بچہ پیدا ہوا؟

مجھے یہ بتا کر قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں بچے کی پیدائش میں ایک سال سے تین سال لگ جاتے ہیں، کئی گھنٹے سے یہ اسی بات پر بضد ہے۔

آپ ہی اسے سمجھاؤ کہ یا تو یہ مان لے کہ یہ ایک سٹوری ہے یا پھر یہ واپس اپنے ملک جا چکا ہے حالانکہ اس نے کلیم کیا ہے کہ ملک میں اس کی جان کو خطرہ ہے اور یہ کینیڈا میں پناہ لینا چاہتا ہے''۔

خاتون آفیسر نے صورتحال کی تفصیل بتا کر میری طرف پریشانی سے اس طرح دیکھا جیسے وہ زچ ہو گئی ہے۔

میں یہ سب سن کر بڑا حیران ہوا اور میں نے افریقی جوان کی طرف دیکھا اور خاتون آفیسر سے کہا:

''کیا میں اس سے علیحدگی میں بات کر سکتا ہوں''۔

اس نے کہا:

یقیناً، ٹھیک ہے۔

میں افریقی کو کو ساتھ لے کر باہر آ گیا۔ میں نے اس کو سمجھایا:

''دیکھو۔ یہ خاتون اچھی ہے تمہاری مدد کرنا چاہتی ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اگر تم اپنا موقف تبدیل کر لو، اگر تمہارا بچہ بھی ہے تو تم اس کو بعد میں یہاں بلا سکتے ہو لیکن اس کو تین سال والی سٹوری میں نہ الجھاؤ۔ اس

سے تمہارا کیس بھی خراب ہوسکتا ہے''۔

میری بات سن کر پہلے تو وہ چپ کھڑا رہا' پھر جب میں نے کہا:

''خاتون کا کچھ پتہ نہیں کہ اس کا موڈ بگڑ جائے اس سے تمہارا نقصان ہو جائے گا اس لیے تم یہ کہو کہ مجھے بیوی نے بتایا ہے اس کے ہاں بچہ ہوا ہے' ہوسکتا ہے میری بیوی غلط کہہ رہی ہے۔ یہ پکی بات ہے کہ میں اپنے ملک نہیں گیا''۔

وہ ''اوکے'' کہہ کر واپس دفتر کی طرف چل دیا۔ اس نے آفیسر کو ری سٹیٹمنٹ دے دی اور جس نے فائل مکمل کر کے افریقی کو جانے دیا۔

بعد میں اس خاتون نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اس کی پریشانی میں مدد کی اور وہ کیس مکمل کرنے میں کامیاب ہوئی۔

اس واقعے کے بعد جب میں نے آفیسر کو اپنی سٹوری بتائی کہ کس طرح پاکستان اور امریکہ میں میرے ساتھ یہ ہوا۔ اب یہاں کینیڈا میں پناہ لینا چاہتا ہوں تو مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ خاتون نے میری ساری سٹوری سن کر فائل تیار کی اور میرے فنگر پرنٹ اور تصویر لینے کے بعد مجھے فارغ کر دیا۔ مجھے بتایا کہ یہ میرے حقوق و مراعات ہیں اور میرے کیس کو کتنا عرصہ لگ سکتا ہے۔ میں مونٹریال میں ایک پاکستانی جاننے والے کے پاس رہنے لگا۔ جس نے مجھے فیکٹری میں یہ کہہ کر جاب دلوادی کہ آپ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود یہاں کوئی دفتر کی جاب حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ آپ کو یہاں کی کوئی پروفیشنل ایجوکیشن نہ مل جائے۔ مجھے فرنچ زبان بھی نہیں آتی تھی۔ فیکٹری میں پاکستانیوں کے علاوہ بہت ساری قومیتوں کے لوگ کام کرتے تھے۔ ان میں عربی، انڈین، بنگلہ دیشی، رشین، افریقی اور فلسطینی شامل تھے۔

چند دنوں میں پاکستانیوں سے میری اچھی سلام دعا ہوگئی تھی۔ اعظم صاحب یونین لیڈر آدمی تھے۔ تعلق لاہور سے تھا اور فیکٹری میں کئی سال سے کام کر رہے تھے۔ اچھے

طریقے سے پیش آتے اور گائیڈ کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔

ایک دن کام سے وقفہ کے دوران اعظم صاحب نے بتایا:

''اس میری ایک فلسطینی ورکر سے کل منہ ماری ہوگئی تھی اور وہ کچھ زیادہ ہی اپنے آپ کو سمجھ رہا تھا''۔

میں نے اس کو کہا:

''وہ اپنی اوقات میں رہے اور اپنے کام سے کام رکھے لیکن لگتا ہے کہ وہ باز نہیں آئے گا''۔

میں نے اعظم صاحب کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا:

''چھوڑو لڑائی میں کیا پڑا ہے۔ ہر بندہ یہاں مصیبت کا مارا ہوا ہے، ہوسکتا ہے اس کا کوئی مسئلہ ہو؟''

جواب میں اعظم صاحب کہنے لگے:

''دیکھ لیں گے اس کو کیا مسئلہ ہے؟''

مانٹریال میں زیادہ تر ایسے غیر ملکیوں کی کثرت تھی جو پناہ کی درخواست کے ساتھ یہاں رہ رہے تھے۔ ان میں اکثریت امریکہ سے کینیڈا میں داخل ہونے والوں کی تھی۔ یہ سب لوگ یہاں کی فیکٹریوں میں مختلف طرح کی جاب کرتے تھے۔ لیبر سٹی کے ماحول میں جب چھٹی ہوتی تھی تو ان لوگوں کا سڑک پر بہت رش نظر آتا تھا۔ جنہوں نے بس اور ٹرین میں سوار ہو کر گھروں کو جانا ہوتا۔ اگلے دن وقفے کے دوران اعظم صاحب نے مجھے بتایا:

''فلسطینی احمد اس سے پھر الجھ پڑا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس کا پکا بندوبست کروں۔ اسے پتہ چلے کہ کسی پاکستانی سے واسطہ پڑا ہے''۔

بڑا ہونے کی وجہ سے میں نے اعظم صاحب سمجھا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے غصے میں کہا:

''ایسی طبیعت صاف کروں کہ آئندہ کسی پاکستانی سے پنگا نہیں لے گا''۔

جمعہ کو میں نے دیکھا کہ اعظم صاحب اسی فلسطینی احمد کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ اس بات پر بڑا حیران ہوا کہ فلسطینی سے ہاتھ ملا کر اعظم صاحب میرے پاس آ گئے۔ مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگے:

''معاملہ حل ہو گیا ہے''۔

میں نے حیرت سے پوچھا کیا ہوا؟

''کل میں نے احمد کو آتے ہی کہہ دیا تھا کہ دیکھو اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا کیونکہ تمہیں اندازہ نہیں ہم پاکستانی کتنے غصے کے تیز ہوتے ہیں اور میں تمہاری شرارتوں، رویے اور بدمعاشی سے اس قدر تنگ آیا ہوں کہ تمہیں قتل کر کے اپنے ملک واپس چلا جاؤں گا' کوئی میرا کیا کر لے گا۔ یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا''۔

اعظم نے بات مکمل کی۔

آج میں بڑا حیران ہوا جب فلسطینی احمد میرے پاس آیا۔ معافی مانگی اور میری داڑھی کو ہاتھ لگا دیا اور کہنے لگا:

''تمہاری کل کی بات کہ میں قتل کر کے اپنے ملک واپس چلا جاؤں گا' اس نے مجھے ساری رات پریشان کیے رکھا۔ میں اپنے آپ سے پوچھتا رہا کہ اعظم کے پاس تو اپنا ملک ہے جو وہ کہتا ہے کہ میں واپس وہاں چلا جاؤں گا لیکن ہم فلسطینیوں کے پاس تو ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جسے ہم اپنا ملک سمجھ سکیں' بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا مجھے بے وطن ہونے کی وجہ سے ہار مان لینی چاہیے اور اعظم سے معذرت کر لوں''۔

میں نے بھی اسے گلے لگا کر بات ختم کر دی۔

تب احمد بولا:

''آپ سچ کہتے ہو وطن بہت بڑا مان ہوتا ہے اور بے وطنوں کی کوئی زندگی

نہیں ہوتی۔ میں اس محرومی کو تسلیم کرتا ہوں''۔

میں اعظم کی بات پر بڑا حیران ہوا اور میرے دل پر بھی بہت اثر ہوا۔ میں نے اعظم سے کہا کہ کل ہم احمد سے ملیں گے اور اس کے احساس اور معافی تلافی پر اس کی دلجوئی کریں گے' آخر وہ بھی مسلمان بھائی ہے اور ہم پاکستان میں فلسطینیوں کی حمایت میں ان کے الگ وطن اور حق خودارادیت پر آواز اٹھاتے اور جلوس نکالتے رہے ہیں۔

اعظم نے میری بات سے اتفاق کیا اور ہم نے احمد کو کھانے کی دعوت دی اور ساتھ بیٹھ کر نہ صرف کھانا کھایا ہے بلکہ اپنے تعلقات کو بحال کرنے کے ساتھ بہت ساری باتیں شیئر کیں کہ کس طرح وہ ظلم اور جبر کا بوجھ اور وطن سے محرومی کا دل و دماغ پر بوجھ اٹھائے دربدر پھر رہے ہیں۔ اس نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے پاکستان واحد ملک ہے جو شدومد سے ان پر ہونے ظلم پر آواز اٹھاتا چلا آ رہا ہے جس پر وہ شکر گزار ہیں۔

...14

کینیڈا میں ٹیکسی چلاتے ہوئے مجھے چند سال ہو گئے تھے۔شروع میں تو بڑا مشکل کام لگا تھا۔ابتدائی دنوں میں ہی ایک عمر رسیدہ عورت نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا

''مجھے تو بہت حیرت ہوتی ہے آپ کس طرح ایک اجنبی کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر اعتبار کر لیتے ہو؟

''میں تو کبھی ایسا نہ کروں۔میں نے تو کسی اجنبی پر کبھی اعتبار کیا''۔

پتہ نہیں یہ عورت اپنا خوف ظاہر کر رہی تھی یا مجھے خوفزدہ کرنا چاہ رہی تھی۔

خیر میں نے اس کو جواب میں کہا کہ یہ ہماری جاب ہے۔ہمیں اعتبار کرنا ہی ہوتا ہے۔

روزانہ مسافروں سے بات چیت کرنے کا مجھے مزہ آنے لگا تھا اور کبھی کبھار خواتین سے اچھی گپ شپ ہو جاتی تھی۔وہ اپنی ذاتی زندگی کے معاملات شیئر کرتیں تو میرے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔یوں مجھے اس معاشرے کے فیملی سسٹم کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی تھی۔مجھے ابھی کسی ایسے مسافر سے واسطہ نہیں پڑا تھا جو وائٹ ہو کر اُردو، پنجابی سمجھتا یا بولتا ہو۔البتہ یہ ہو چکا تھا کہ ایک دو سواریوں کو پنجابی میں فون پر دوستوں سے بات کرنے پر بہت اعتراض اور تکلیف ہوئی تھی۔ان کا کہنا تھا کہ مجھے سواری کی موجودگی میں انگریزی میں بات کرنی چاہیے ورنہ انہیں بہت فکرمندی ہوتی ہے کہ شاید ہمارے خلاف بات کر رہے ہو۔

میں نے ان کی بات سے اتفاق کیا تھا لیکن ان کو مشورہ بھی دیا کہ کینیڈا اب ملٹی کلچرل کنٹری ہے اور انہیں بھی انگریزی کے علاوہ دیگر زبانیں سیکھنے کی کوشش کرنا

ہوگی' اگر ہم انگریزی سیکھ کر آپ لوگوں سے بول سکتے ہیں تو آپ کو بھی ایسا کرنا ہوگا۔

ایک رات شفٹ کے دوران میری گاڑی میں میری نوجوان لڑکی آ کر بیٹھی تو ہیلو ہائے کے بعد اس کی منزل کے بارے میں پوچھا جو اس نے بتادی۔ میں اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ کانفرنس کال پر تھا۔ میں نے ان کو کہا:

''آپ لوگ بات چیت کرو۔ میرے ساتھ ایک خوبصورت گوری لڑکی آ کر بیٹھی ہے۔ میں ذرا اس سے کہانی کرلوں''۔

اس کے بعد میں نے خاموشی توڑنے کے لیے پوچھا:

''آپ کہاں جارہی ہیں؟''

پھر کچھ اور پوچھا تو لڑکی نپے تلے اور معقول طریقے سے میرے ہر سوال کا جواب دے رہی تھی۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھ سے بات کرنا بھی چاہ رہی ہے لیکن محتاط بھی ہے۔

قبل ازیں میرا تجربہ تھا کہ جب خواتین سے بات کرتا تھا تو وہ کھلکھلا کہ بات کرتی تھیں۔ اب میں بھی تھوڑا سا محتاط انداز سے اس سے بات کر رہا تھا۔ زیادہ اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کھل کر بات پوچھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی رائیڈ زیادہ لمبی نہیں تھی۔ 15 منٹ میں اس ایڈریس پر پہنچ گیا جہاں اس نے اترنا تھا۔

اس نے مجھے کرایہ ادا کیا اور میں نے ''بڑا تھینک یو'' اس لیے کیا کہ اس نے ٹپ بھی دی تھی۔ وہ گاڑی سے نہیں اتر رہی تھی۔ میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس نے سوال کیا:

''میرے سے کیا کہانی ڈالنا چاہتے تھے۔ تم نے بتایا ہی نہیں''؟

یہ بات وہ اُردو میں کر رہی تھی۔ میرے تو اوسان خطا ہو گئے کہ ایک گوری لڑکی کس طرح اُردو بول رہی ہے اور مجھ سے سوال کر رہی ہے۔ جو میں نے اپنے دوستوں کو اس کے بارے میں کہا تھا۔ شرمندگی سے اس کے سامنے میرے پسینے چھوٹ گئے۔

کوئی جواب نہ بن پڑا تو میں نے کہا:

''کچھ نہیں، میں تو ایسے ہی مذاق کر رہا تھا۔''

''نہیں نہیں کچھ تو کہانی تمہارے ذہن میں ہوگی جو تم میرے ساتھ کرنا چاہتے تھے''۔

یہ کہتے ہوئے وہ اس طرح مسکرا رہی تھی جیسے میری بری حالت کا مزہ بھی لے رہی ہو۔

میں نے اس کو کہا:

''مجھے معاف کر دیں، مجھ سے غلطی ہوگئی اور مجھے نہیں علم تھا کہ آپ کو اُردو کی سمجھ آتی ہے۔''

اس نے کہا:

''کوئی بات نہیں، میں اُردو اچھی طرح سمجھ اور بول سکتی ہوں اور ٹیکسی رائیڈ کے دوران ایک دو دفعہ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ تمہیں اب کینیڈا میں محتاط رہنا چاہیئے' کوئی ایسی ویسی بات کرتے ہوئے وہ بھی بالخصوص یہاں کی خواتین کے بارے میں''۔

اس نے یہ کہہ کر مجھے مشورہ دے ڈالا۔

پھر کہنے لگی:

''آگے آپ کی مرضی ہے اس پر عمل کریں یا نہ کریں''۔

اس کی بات پر میں اور بھی شرمندہ ہو گیا اور میرا دل چاہا کہ میں دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل جاؤں کیونکہ یہ واقعہ میرے ساتھ پہلی دفعہ ہوا تھا۔ مجھے اس قدر شرمندگی اٹھانا پڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھول کر اتر جاتی میں نے پھر سوری کرتے ہوئے اس سے کہا:

''میں آئندہ احتیاط کروں گا لیکن خدا کے لیے مجھے یہ تو بتا دو کہ تم نے اُردو کہاں سے سیکھی ہے''؟

اس نے کہا:

''چلیں تمہیں بتا دیتی ہوں کہ یونیورسٹی میں میرا بوائے فرینڈ پاکستانی ہے اور اس کے دوستوں کے ساتھ بیٹھنے اور گپ شپ کرنے سے میں نے اس قدر اُردو سمجھنا اور بولنا سیکھ لیا ہے۔ جب بھی ہم کسی پاکستانی یا انڈین پارٹی میں جاتے ہیں تو مزہ آتا ہے کہ لوگ میرے بارے میں بات کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ان کی زبان نہیں جانتی' بعد میں ان کو میں کہہ دیتی ہوں کہ اس طرح کسی کے بارے میں بات کرتے ہوئے محتاط رہنا چاہیے''۔

یہ کہہ کر وہ گاڑی سے اتر گئی اور میں پشیمان اس کو بلڈنگ کے اندر جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

ایک اور واقعہ میں ایک افریقی شخص ایک معذور بچے کے ساتھ آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس نے ایڈریس بتایا اور کہا کہ وہ اس بچے کو وہاں ڈراپ کرے گا اور واپس آئے گا۔ میں اس وقت ایک دوست کے ساتھ فون پر بات کر رہا تھا۔ اس نے مجھے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟

میں نے کہا کہ ایک افریقی کالا شخص بیٹھا ہے۔ یہ بچے کو وہاں چھوڑے گا۔ بچے کو فوڈ کھلا رہا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ گاڑی کے اندر بھی گرا رہا ہے''۔

میں نے غصے سے کہا:

''عجیب پاگل ٹائپ آدمی ہے''۔

دوست سے بات کرتا ہوا میں ایڈریس پر پہنچ گیا۔

اس شخص نے نیچے اترتے ہوئے کہا:

''میرا انتظار کرو میں بچے کو چھوڑ کر آتا ہوں''۔

یہ شخص ایک سپورٹ ورکر تھا جو بچے کو گھر تک چھوڑنے کے لیے گیا اور جب وہ کچھ دیر بعد واپس آ کر گاڑی میں بیٹھا تو کہنے لگا:

''مجھے واپس اسی جگہ اتارو جہاں سے اٹھایا تھا۔''

میں نے کہا:

''ٹھیک ہے''۔اور میں نے گاڑی چلادی۔

اس نے سوال کیا:

''تم نے مجھے پاگل کس لیے کہا تھا''؟

اس کا اُردو میں سوال سن کر مجھے حیرت سے بڑھ کر گھبراہٹ شروع ہوگئی۔

میں نے ہکلاتے ہوئے کہا:

''میں نے آپ کو پاگل کب کہا ہے' کیا آپ اُردو سمجھتے ہیں''؟

اس نے جواب دیا:

''ہاں میں اُردو سمجھتا ہوں آپ نے اپنے دوست کو فون پر میرے بارے میں پاگل ہی کہا تھا کہ میں فوڈ نیچے گرا رہا ہوں''۔

میں نے بات کو کور کرنے کی بہت کوشش کی۔

لیکن اس نے کہا:

''اب آپ جھوٹ بھی بول رہے ہو''۔پھر کہنے لگا:

''میں بھی مسلمان ہوں اور حدیث نبوی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کہنی چاہیے اس کو ناگوار گزرے۔''

اس نے اپنا نام اسماعیل بتایا اور کہا کہ امریکہ میں مقیم تھا تو ایک ایسی جگہ کام کرتا تھا جہاں افغانی، پاکستانی اور انڈین کام کرتے تھے۔ان سے پشتو، اُردو پنجابی سیکھ کر سمجھ اور بول سکتا ہوں''۔

میں نے اسماعیل سے معذرت کی کہ میں نے اس کے بارے میں یہ بات کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا۔اس بات پر بھی شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے احساس دلایا ہے کہ مجھے جاب پر محتاط رہنا چاہیے۔

اس کے بعد اسماعیل نے مجھے ایک واقعہ بتایا کہ وہ نیو یارک میں ٹیکسی میں سفر کر رہا تھا۔ ڈرائیور ایک سکھ پنجابی تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھے ہوئے وہ فون پر کسی کو کہہ رہا تھا:

''یہ میری گاڑی میں ایک کالا بیٹھا ہے۔ یہ لوگ دیر تک نہاتے بھی نہیں۔ ان سے بہت بدبو آتی ہے وغیرہ وغیرہ۔''

میں یہ سب سن رہا تھا اس نے ایک آدھ گالی بھی میرے حوالے سے دی تھی۔ میں خاموشی سے بیٹھا اپنی منزل تک پہنچنے کا انتظار کرتا رہا۔ جیسے ہی اس نے میرے ایڈریس پر گاڑی روکی تو میں نے سوال کیا:

''تم نے گالی کس کو نکالی ہے''؟

میرے منہ سے پنجابی میں یہ سوال سننے کے بعد اس ڈرائیور کے طوطے اڑ گئے۔ وہ انکاری ہونے لگا کہ میں نے کچھ نہیں کہا۔

میں نے کہا:

''مجھے سب علم ہے۔ میں اُردو پنجابی نہ صرف سمجھتا ہوں بلکہ بول بھی سکتا ہوں اسی لیے میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ تم نے میرے بارے میں جو بھی باتیں کی ہیں تم نے بہت غلط کیا ہے۔ میں تمہاری کمپلینٹ کروں گا۔ کسٹمرز کے ساتھ اس طرح کا رویہ رکھتے ہو اور گالیاں بھی دیتے ہو۔''

وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا:

''مجھے معاف کر دیں اور آپ کرایہ بھی نہ دیں لیکن میری کمپلینٹ نہ کریں میں آئندہ اس طرح اپنی زبان میں بے عزتی کروں گا اور نہ ہی ایسے لفظ استعمال کروں گا''۔

اس نے 40 ڈالر کا کرایہ بھی چھوڑ دیا اور کہا کہ میری کمپلینٹ نہ کریں ورنہ میری روٹی روزی چھن جائے گی۔

میں نے کہا:

''ٹھیک ہے لیکن تم میرے ساتھ پکا وعدہ کرو آئندہ کوئی کالا ہو یا گورا اس کے بارے میں تمہارے منہ سے ایسی بات نہیں نکلنی چاہیے۔''

اس نے وعدہ کیا کہ آئندہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔

کینیڈا میں مختلف قومیتوں اور زبانوں کے لوگ آپس میں مل جل کر رہنے سے بہت کچھ سیکھ چکے ہیں۔ زبان رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور بعض لوگ اس معاملے بہت تیز ہیں اور بہت آسانی سے دوسری زبانوں کو سیکھ لیتے ہیں۔ اس لیے کسی جاب یا عام مقامات پر نازیبا الفاظ کے استعمال سے آپ کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ٹیکسی سے پہلے میں ایک کنسٹرکشن کمپنی میں کام کرتا تھا۔ وہاں ایک افریقی نے اپنی ریہڑی میرے پاؤں کے اوپر چڑھا دی۔ مجھے بہت درد ہوئی تو میں نے اسے بہن کی گالی دے دی۔

جواب میں کالے نے بھی مجھے وہی گالی دے دی۔ میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا کہ کالے کو اس گالی کا پتہ ہے۔ مجھے فوراً سوری کرنا پڑا۔ اسے بتایا کہ مجھے اس بارے علم نہیں تھا اور میں آئندہ محتاط رہوں گا' تب جا کر کالے نے میری جان چھوڑی ورنہ وہ گالی سے بڑھ کر میرے گلے پڑنے کو تیار تھا۔

...15

میں اپنی گاڑی میں ایک بینک کے باہر بیٹھا ہوا بینک کھلنے کا انتظار کر رہا تھا کیونکہ کینیڈا میں بینک 9.30 پر کھلتے ہیں۔

اس دوران ساتھ میں ایک وین آ کر رکی اور اس میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص اترا اور سیدھا چلتا ہوا میری طرف آیا۔ میری ونڈو پہ دستک دی۔

میں نے ونڈو نیچے کی تو اس شخص نے اونچی آواز میں بدزبانی شروع کر دی۔

اس کا کہنا تھا:

''تم لوگ امیگرنٹ ہو' کینیڈا میں آ کر ہماری جابز اور بزنسز پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہاں سے رقوم بنا کر اپنے ملکوں کو بھیج رہے ہو۔ ہم لوگ جابز کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں' گو بیک ٹو یور کنٹری۔ ہمیں امن سے رہنے دو''۔

مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی اور غصہ بھی آیا۔

مجھے لگا کہ یہ شخص جس انداز سے گرج رہا ہے یہ کہیں مجھ پر حملہ نہ کر دے۔ میں نے فوری طور پر ونڈو کو اوپر کیا۔ پولیس کو کال کرنے کے لیے فون پر نمبر ڈائل کر رہا تھا تو وہ شخص باہر سے اونچی آواز میں بولتا چلا جا رہا تھا:

''پولیس کو کر و کال۔ یہ میری گاڑی کا نمبر ہے اور ان کو بتاؤ۔ میں نے تمہاری بے عزتی کی ہے اور یہ باتیں کہی ہیں''۔

ونڈو اوپر ہونے کے باوجود اس کی آواز مجھے صاف سنائی دے رہی تھی۔

وہ شخص یہ کہہ کر اپنی وین کی طرف چل دیا اور اس میں بیٹھ کر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اس دوران پولیس فون لائن پر مجھے پوچھا گیا کہ کس شکل وشبہات کا شخص ہے۔کیا کہا ہے اور اس کی وین کا نمبر کیا ہے؟

میں نے پولیس کو یہ معلومات دیں اور اس کی نمبر پلیٹ کے بارے میں بتایا۔ پولیس کی طرف سے مجھے ہدایت کی گئی کہ آپ یہاں سے ''موو'' ہو جائیں کیونکہ وہ شخص حملہ بھی کر سکتا ہے۔جب وہ یہاں سے چلا گیا تو میں پریشان گاڑی میں بیٹھا رہا۔آدھے گھنٹے کے بعد پولیس کی کال آئی۔مجھے بتایا:

''ہم نے اس شخص کا نمبر پلیٹ سے ریکارڈ چیک کیا ہے۔اس کے ہوم فون نمبر پر اس کی بیوی سے بات ہوئی ہے۔وہ ایک اچھی خاتون ہے۔اس کا کہنا ہے کہ اس کا خاوند ذہنی مریض ہے اور آج اس نے ہسپتال داخل ہونا تھا' لیکن شاید وہ وہاں نہیں پہنچا۔اس نے اپنے مرض کی وجہ سے تم سے بد تمیزی کی ہے''۔

میں نے یہ بات سنی تو میں نے جواب میں کہا:

''اگر اس شخص کی بیوی اچھی خاتون ہے اور وہ ذہنی مریض ہونے کی وجہ سے پبلک میں بدتمیزی کرتا پھر رہا ہے تو اس سے میرا کیا لینا دینا ہے؟ کمیونٹی کے لیے خطرہ بنے ایسے شخص کو گرفتار کرنا اور ہسپتال داخل کروانا آپ کی ذمہ داری ہے' اگر اس نے میرے ساتھ نسلی امتیاز کا مظاہرہ کرتے ہوئے بدتمیزی کی ہے اور دھمکیاں دی ہیں تو یہ کینیڈا کے قوانین کی خلاف ورزی ہے۔وہ کسی اور کے ساتھ بھی ایسا کر کے اسے نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔آپ اسے گرفتار کریں''۔

میں نے پولیس کو کھری کھری سنا دیں۔

پولیس والے نے میرے بات کو پوری طرح سنا اور جواب میں کہا:

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔آپ کو اس شخص کے طرزِ عمل سے دُکھ ہوا ہے، مگر ہم اسے گرفتار نہیں کریں گے اور نہ ہی زبردستی ہسپتال بھیج سکتے ہیں''۔

پھر مجھے کہا کہ آپ ایسے افراد سے محتاط رہیں۔

ایسے واقعات میں پولیس کے موقع پر آنے، صورتحال کا جائزہ لینے اور کارروائی نہ کرنے کے معاملے میں متعدد لوگوں سے میں نے سنا تھا۔

اتفاقاً ایک ریٹائرڈ پولیس آفیسر سے ایک کمیونٹی گروپ میں ملاقات ہوگئی۔

میں نے اس سے اپنے ساتھ ہونے والے واقعے پر پولیس کے موقعہ پر نہ آنے اور رسمی کارروائی پر حیرت وافسوس کا اظہار اور شکوہ بھی کیا کہ اس طرح تو پولیس شہریوں کو تحفظ نہیں دے سکتی۔

پولیس آفیسر اچھا آدمی تھا۔اس نے میری بات کو سنا اور پھر اطمینان سے بولا:

''آپ کال کرنے کے بعد یہ مت سمجھیں کہ پولیس فوراً بھاگی چلی آئے گی۔وہ آپ کے معاملے کی نوعیت کو سمجھیں گے کہ یہ ایمرجنسی ہے یا نہیں؟ پولیس نے ہر معاملے کو اپنے رولز کے تحت ترجیح کے مطابق نمٹانا ہوتا ہے۔ پولیس اتنی بھی فارغ نہیں ہوتی کہ نان ایمرجنسی کالز پر نکل کھڑی ہو۔ ہر کال کے رسپانس میں پولیس کا پٹرول اور وقت خرچ ہوتا ہے اور وسائل احتیاط سے استعمال کرنا بھی ضروری ہوتا ہے''۔

یہ بات کہہ کر اس نے پولیس کے سیٹ اَپ کی حدود بھی بتا دیں۔

پولیس آفیسر کی اس بات پر مجھے بڑا عجیب لگا اور میں نے کہا:

''اسے تو شہری خود کو محفوظ ہرگز نہیں سمجھتے۔

کیسے ممکن ہے کہ اگر کوئی آپ کو گالی اور دھمکیاں دے اور آپ تشدد کا نشانہ بھی بن جائیں تو پولیس مدد کو نہ آ سکے؟''

میری اس تشویش کو سمجھتے ہوتے پولیس والا مسکرایا اور کہنے لگا:

''یہ واقعی بڑا فرسٹیٹنگ ہوتا ہے. جب آپ پولیس کو مدد کے لیے کال کریں اور وہ گھنٹوں بعد بھی نہ آئے یا فون پر ہی ٹرخا دے''۔

میں آپ کو ایسے حالات میں اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر ''ٹپ'' دے دیتا ہوں اور عام حالات میں یہ بتایا نہیں جاتا۔ جب بھی پولیس کو مدد کے لیے کال کریں تو بتائیں کہ اس شخص نے دھمکی دی کہ اس کے پاس چاقو ہے یا بندوق جیسا ہتھیار ہے اور مجھے مار دے گا۔ ایسا بیان پولیس سنجیدگی سے ایمرجنسی کے طور لے گی اور چند منٹ میں موقع پر پہنچے گی۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جب پولیس کو کال کریں تو بات بتانے کے دوران فون کو بند کر دیں اور جب پولیس کی کال بیک آئے تو اسے ریسپانس نہ کریں اور دوبار کال بھی ایٹنڈ نہ کریں تو پولیس سینٹر میں پریشانی ہوگی کہ کالر سیریس سچوایشن میں ہوسکتا ہے' تب وہ آپ کی لوکیشن ڈھونڈ کر فوراً موقعہ پر پہنچنے کی کوشش کریں گے''۔

میں نے پولیس والے کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے حقیقت حال سے آگاہ کیا تو اس نے جواب میں کہا:

''نو پرابلم لیکن محتاط رہیں اور اس کی ٹپس کا استعمال اپنی ذمہ داری پر کرنا''۔

کینیڈا میں قانون اور اس پر عملدرآمد کے بارے ابھی تک ہمارے مشاہدے میں آیا ہے اگر آپ کو کسی نے ایک مکہ مار دیا تو آپ نے جواب میں دو مکے مار کر اس کو زخمی کر دیا ہے تو پولیس آپ کو قصوروار ٹھہرا سکتی ہے۔ آپ کو قانون کی رو سے اس کے مکے کے

بعد پولیس کو کال کر کے مدد طلب کرنی چاہیئے تھی' اگر کوئی شخص زمین پر گرا پڑا نظر آئے تو اس کو ہاتھ لگانے یا اٹھانے کو کوشش نہ کریں' ورنہ ایسی مدد کی کوشش بھی آپ کے گلے پڑ سکتی ہے۔ اس دوران اس کا کوئی ہڈی جوڑ نکل گیا یا حالت مزید خراب ہوگئی تو بعد میں آنے والے پیرا میڈیکس آپ کو مورد الزام ٹھہرائیں گے۔ اس لیے 99 فیصد لوگ ایسا کوئی خطرہ مول نہیں لیتے اور پولیس کو کال کر کے بری الذمہ ہو جاتے ہیں کہ کوئی شخص اس جگہ گرا پڑا ہے اور اسے ہیلپ کی ضرورت ہے۔

...16

کینیڈا میں حیرت انگیز طور پر ڈائبٹیز جسے شوگر بھی کہا جاتا ہے کا مرض عام ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ جن میں خواتین' مرد اور بچے شامل ہیں اس بیماری کا شکار ہیں۔

جدید تعلیم وشعور' خالص خوراک کی دستیابی' صاف ستھرے ماحول اور آب وہوا کے باوجود یہ بڑی حیرت ناک اور تشویشناک صورتحال معلوم ہوتی ہے۔

دستیاب اعداد وشمار کے مطابق کینیڈا میں تیس لاکھ ستر ہزار نفوس شوگر جیسے خطرناک مرض میں مبتلا ہیں۔

ان میں سے نو اشاریہ چار فیصد ایسے لوگ ہیں جن کی عمر ایک سال یا اس سے زائد ہے۔شوگر میں مبتلا مردوں کی تعداد 1.10 فیصد جبکہ عورتوں کی تعداد 7.8 فیصد بتائی جاتی ہے۔

شوگر کے مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے بارے' سروے میں انکشاف ہوا ہے کہ کم آمدن والے گھرانوں کا مسلسل ذہنی دباؤ کا شکار رہنا' ورزش نہ کرنا' وزن کا بڑھنا جسم میں چربی کی زیادہ مقدار بڑی وجوہات ہیں۔

ٹائپ ٹو ڈائبٹیز یعنی دوسرے درجے کی شوگر کی بیماری کا شکار مریضوں میں بہت سارے ملکوں سے آئے ہوئے لاطینی' عرب' ساؤتھ ایشین اور افریقی ممالک کے لوگ شامل ہیں۔

شوگر کا سب سے زیادہ خطرہ کینیڈا کی فرسٹ نیشن کمیونٹی کو ہوتا ہے۔

رینڈی کا تعلق بھی فرسٹ نیشن کمیونٹی سے تھا۔ میں جب اس سے ملا تو وہ ایک الیکٹرانک ویل چیئر پر ڈائلسز کے لیے ہاسپٹل جایا کرتا تھا۔ ہفتے میں تین دن اس سے

ملاقات ہوتی تو گپ شپ بھی چلتی رہتی۔

جب میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کو ڈائلسز کے لیے کیوں جانا پڑتا ہے؟ اس نے بتایا کہ اسے پچھلے 15 سال سے شوگر کا مرض ہے' حالانکہ اس کی فیملی میں یہ مرض پہلے کسی کو نہیں تھا۔ اس لیے وہ بھی حیران تھا۔

رینڈی نے بتایا کہ وہ فٹ بال کا کھلاڑی تھا اور اس کا قد چھ فٹ دو انچ تھا۔ وہ کینیڈا اور امریکہ میں نیشنل لیگ کھیلا کرتا تھا۔ اس کی سالانہ آمدنی 8 سے 10 لاکھ ڈالرز کے درمیان تھی۔

رینڈی نے بتایا 90ء کی دہائی میں وہ فٹ بال کا مشہور کھلاڑی تھا۔ اتنی بڑی رقم اس کی آمدن ہوا کرتی تھی تو وہ اپنے بہن بھائیوں اور خاندان کے کچھ لوگوں کی مالی مدد کیا کرتا تھا' حتیٰ کہ اس نے اپنی بہن کو ایک گھر بھی خرید کر دیا تھا۔

رینڈی اب جس گھر میں رہتا تھا وہ دو منزلہ گھر تھا۔ ایک حصہ اس نے کرایہ پر دے رکھا تھا۔ اس گھر کے بارے پوچھا تو کہنے لگا:

''یہ بھی میں نے اپنے عروج کے دور میں خریدا تھا۔ جہاں میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ دو بیٹے جوان ہونے کے باوجود گھر میں ساتھ رہتے ہیں اور میں اس پر خوش ہوں کہ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گئے''۔

رینڈی اپنی بیٹری ویل چیئر کو دیگر معذور افراد کے مقابلے میں مہارت سے چلاتا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا:

''ایسا کیا ہوا کہ اسے ویل چیئر پر آنا پڑا؟''

اس نے بتایا:

''شوگر کا مرض قابو سے باہر ہو گیا تھا' حالانکہ اسی نے بہت کوشش کی کہ اپنی باڈی کو کنٹرول میں رکھوں لیکن بیماری کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا' چاہے کوئی کتنا بڑا طاقتور ہو۔

یہی کچھ میرے ساتھ ہوا''۔

رینڈی یہ کہتے ہوئے بجھ سا گیا حالانکہ وہ اکثر اچھے موڈ میں گفتگو کیا کرتا تھا۔

''پھر کیا ہوا''؟

میں نے مزید سوال کیا۔

اس نے بتایا:

''ہونا کیا تھا' ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کی دونوں ٹانگیں کاٹنا پڑیں گی اور گھٹنوں سے اُوپر میری جان بچانے کے لیے دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئی''۔

رینڈی نے بتایا:

''میں اس محرومی پر بہت رویا۔ چھ فٹ سے زائد قد کا آدمی اب بونا بن چکا تھا۔اس نے ایسا کبھی سوچا بھی نہ تھا''۔

اس نے بتایا کہ ایک عرصہ تک وہ ڈپریشن میں رہا اور لگتا تھا کہ ساری عمر اسی ٹراما میں گزر جائے گی۔

دونوں ٹانگوں سے محرومی کے بعد بحالی بہت مشکل کام تھا۔بستر پر لیٹے لیٹے اس نے خود کو حوصلہ دیا:

''کیا تم نے ساری زندگی بستر پر گزارنی ہے یا ہمت کر کے اپنے آپ کو اس قابل بنانا ہے کہ باہر کی دنیا میں بھی آنے جانے کا سلسلہ چل سکے''؟

رینڈی نے اس صورتحال میں اپنی فیملی سے متعلق بتایا کہ مجھے ان کا خیال بار بار آتا۔اس بات پر خود کو حوصلہ دیتا تھا کہ اس کی معذوری ان کی زندگی اجیرن کر دے گی۔اس سوچ اور خیال سے وہ اپنے آپ کو اس قابل بنانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس نے مایوسی کو جھٹک کر نارمل زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔

اب وہ گھر میں بیٹھ کر کچھ کام کر لیتا تھا۔اپنے ایک بیٹے کو اس کی تعلیم اور ہنر سیکھنے میں مالی طور پر مدد کی۔

اس کے ساتھ اس نے اپنے گھر کا ایک حصہ کرائے پر بھی دے دیا جس سے مناسب رقم ملنے لگی' کچھ اچھے دوستوں نے بھی مشکل وقت میں میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔جس پر میں انہیں یاد رکھتا اور ہمیشہ دعائیں دیتا ہوں۔رینڈی نے بڑے اچھے موڈ میں اپنی زندگی میں واپسی کے سفر بارے میں بیان کیا۔

رینڈی کے ساتھ مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی۔وہ کھیل اور سیاست پر بات چیت کو پسند کرتا تھا۔

گزشتہ سال جب میں چھٹیوں کے بعد کینیڈا گیا تو مجھے پتہ چلا رینڈی کا انتقال ہو گیا ہے۔

اس کی ساری باتیں ذہن میں گھومتی رہیں کہ اس شخص کی زندگی بھی عروج اور زوال کی ایک کہانی تھی۔

رابن سے میری ملاقات مقامی ہسپتال میں اس وقت ہوئی جب وہ ہسپتال سے ایک سینئر ہوم میں جا رہا تھا اور اس کے ساتھ کچھ سامان بھی تھا۔رابن کا تعلق فرسٹ نیشن قبیلے سے تھا۔

جب رابن سے پوچھا:

''آپ کب سے ہاسپٹل میں تھے اور کدھر جا رہے ہیں''؟

اس نے بتایا:

''پچھلے چھ ماہ سے میں ہسپتال میں تھا کیونکہ میری ٹانگ کاٹی جانی تھی لیکن ایک تو فہرست لمبی تھی دوسرا جب بھی میرا نام آتا تو بلڈ پریشر کنٹرول نہیں ہوتا تھا۔اس لیے اسے التوا میں ڈال دیا جاتا تھا''

''آپ کی ٹانگ کیوں کاٹنی پڑی''؟

میرے سوال پر رابن نے بتایا:

''میری شوگر اس قدر بڑھ گئی تھی کہ کنٹرول بہت مشکل تھا۔اس لیے ڈاکٹر

نے تجویز کیا تھا کہ میری ٹانگ کاٹنی پڑے گی''۔

دیکھنے میں روبن 50 سال سے اوپر کا لگ رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو شوگر کب سے ہے؟

اس نے بتایا کہ 10 سال سے ہے۔ جب وہ 40 سال کا تھا تو اس کو شوگر تشخیص ہوئی تھی۔ رابن کا کہنا تھا کہ اس کی فیملی میں کچھ لوگوں کو شوگر تھی اور کچھ کو نہیں تھی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ رابن روزانہ کئی کئی کلومیٹر پیدل چلتا تھا لیکن اسے اس وقت حیرت اور مایوسی ہوئی جب اسے شوگر تشخیص ہوگئی۔ اس کا کئی کئی کلومیٹر پیدل چلنا بھی کام نہیں آیا۔

رابن نے بتایا کہ میں چھ مہینے بعد سورج دیکھ رہا ہوں۔ باہر کی دنیا میں لوگوں کو چلتا پھرتا ہوا دیکھ کر زندگی کا احساس ہوا ہے' ورنہ میں ہسپتال کے کمرے میں پڑا تھا اور یوں لگتا تھا کہ جیسے میں قید خانے میں ہوں۔

ڈاکٹر اور نرسوں کے علاوہ اپنے جیسے دوسرے مریضوں سے آشنائی تو ہوگئی تھی لیکن باہر کی زندگی کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ رابن نے خود ہی اپنی رو میں سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

''ہسپتال میں داخل ہو کر چھ مہینے تک اپنی سرجری کے انتظار میں مَیں کئی بار بہت مایوس ہوا اور رویا۔ مجھے اپنے گھر والے اور دوست بہت یاد آتے تھے کیونکہ یہاں شہر میں ان میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔''

رابن نے بتایا کہ ہسپتال میں قیام کے دوران ہی اسے اپنے بھائی کے مرنے کی خبر ملی جو برف باری میں ایک سکڈو (سنوموبائل) کے حادثہ میں جاں بحق ہوگیا تھا۔

''بھائی مجھے بہت عزیز تھا۔ مجھے فون کیا کرتا تھا لیکن جب کئی دن تک اس کا فون نہیں آیا تو گھر والوں نے اس کی موت کو مجھ سے چھپائے رکھا' لیکن میرے اصرار پر مجھے بتایا تو میں دھاڑیں مار مار کر رویا' ساتھ والے مریضوں اور نرسوں نے مجھے دلاسہ دیا۔ اس غم سے نکلنا میرے لیے امر

محال بن گیا ہے''۔

یہ کہتے ہوئے رابن کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

رابن کہنے لگا کہ صحت بہت بڑی نعمت ہے لیکن ہم اس کی قدر نہیں کرتے۔ ہمارے جیسے لوگوں سے دوسروں کو سبق حاصل کرنا چاہیے جو دولت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں اور اس بات کو بھول چکے ہیں کہ اصل دولت تو صحت ہی ہے۔

میں نے رابن کو دلاسہ دیا اور اس کی حالت زار پر افسوس کا اظہار بھی کیا۔ اسے اُمید بھی دلائی:

''آپ جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے''۔

لیکن جب میں اس کو دوبارہ ملا تو وہ اسی ہسپتال میں ڈائلسز کے لیے جانا شروع ہو گیا تھا کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

...17

کیتھی واحد ماں تھی جو گروپ ہوم میں اپنے بیٹے ماکو کی کسی بھی اپوائنٹمنٹ پر خود ساتھ جاتی تھی۔اس کے لیے وہ پہلے سے اپنی گاڑی پر وہاں موجود ہوتی تھی۔

قبل ازیں میں نے کبھی بھی کسی ماں یا باپ کو اپنے معذور بچے سے اس قدر مانوس اور فکر مند نہیں پایا تھا۔

کیتھی کے بیٹے ماکو کا وزن تیزی سے بڑھ رہا تھا کیونکہ وہ فرائز کھانے کا بہت شوقین تھا۔اس کی سپورٹ ورکرز کے لیے اس کی وہیل چیئر دھکیلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ماکو کے مختلف میڈیکل کلینکس پر ٹیسٹ وغیرہ چل رہے تھے جس کے لیے کیتھی ہر اپوائنٹمنٹ پر ساتھ جانا پسند کرتی تھی۔دورانِ سفر وہ بیٹے سے باتیں بھی کرتی تھی۔

ماکو کی حالت یہ تھی کہ وہ خود سے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی کوئی جملہ بول سکتا تھا۔کیتھی کو میں نے دیکھا کہ وہ ایک جان نچھاور کرنے والی بے تاب ماں کی طرح بیٹے سے پیار کرتی تھی۔ایک دن وہ ماکو کو ڈاکٹر کے کلینک سے فارغ ہو کر سیدھی جوتوں کی معروف دکان پر لے گئی اور کینیڈین فٹ ویئر سے مہنگے جوتے اور جرابیں خرید کر دیں۔ مجھے اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ یہ نوجوان جس کی عمر 35 سال ہو چکی تھی چل پھر بھی نہیں سکتا' لیکن ماں چاہتی تھی کہ اس کو نئے جوتے اور جرابیں لے کر دے' صرف بیٹے کو بتانے کے لیے کہ وہ اس کے پیار میں نئے جوتے اور جرابیں خرید رہی ہے۔کیتھی بیٹے کو گھر سے کلینک جانے' وہاں چیک اَپ اور بعد میں واپس گروپ ہوم آنے تک کمپنی دیتی تھی۔اس کے بعد بڑی محبت اور جوش سے اس سے رخصت ہو جاتی۔

میں یہ سلسلہ کئی بار دیکھ چکا تھا اور مجھے تجسس تھا کہ میں کیتھی سے پوچھوں کہ اس کی

کہانی کیا ہے؟

اس بچے کے ساتھ کیا ہوا؟ اس کی تفصیل اس کی زبانی سننا چاہتا تھا۔

کیتھی اس دن اچھے موڈ میں تھی جب میں نے اسے سوال کیا:

''آپ کا یہ بیٹا کب معذوری کا شکار ہوا''؟

اس نے بتایا:

'' میں اپنے خاوند کے ساتھ پرتگال سے 80 کی دہائی میں کینیڈا آئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر 22 سال تھی۔ اس کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ جب وہ ہاسپٹل میں داخل ہوئی تو پورا دن گزر گیا بچے کی پیدائش نہیں ہو رہی تھی اور ڈاکٹر انتظار کر رہے تھے کہ بچہ نارمل ڈلیور ہو جائے۔ اس دوران میں بہت تکلیف سے گزری لیکن ڈاکٹر اس کوشش میں تھے کہ نارمل ڈلیوری ہو جو نہ ہو سکی اور بالآخر آپریشن کے ذریعے میرا پہلا بچہ ما کو پیدا ہوا۔

'' پہلے بچے کی پیدائش پر میں بہت خوش تھی کہ میں ماں بن گئی ہوں''۔

کیتھی نے بات جاری رکھی:

''میرا خاوند بھی بہت خوش تھا کہ وہ باپ بن گیا ہے۔ ہم نے اپنے والدین و دیگر رشتہ داروں میں یہ خبر بڑی خوشی سے دی تھی۔

اگلے دن بچے کے ساتھ ہمیں گھر جانے کی اجازت دے دی گئی اور اس کے بعد میں ہر ہفتے بچے کو چیک اَپ کے لیے ہسپتال لے کر آتی تو وہاں دیگر چھوٹے بچے موجود ہوتے تھے۔ جب میں دیکھتی تو وہ ہاتھ اور ٹانگیں ہلاتے اور کھیل بھی رہے ہوتے تھے جب کہ میرا بیٹا بے سدھ لیٹا رہتا تھا۔ میں نے اس بارے میں ڈاکٹر سے بات بھی کی کہ یہ بچہ اس طرح کیوں لیٹا رہتا ہے جبکہ دوسرے بچے حرکت کرتے رہتے ہیں۔ میرے دل کو ایک

دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں بچے کو کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟

میرے سوال پر ڈاکٹرز نے تسلی دی:

''جیسے جیسے بڑا ہو گا ٹھیک ہو جائے گا''۔

''میں نے بھی ان کی بات پر یقین کر لیا اور اس دن کا انتظار کرنے لگی کہ جب میرا بچہ تجھ سے بات کرے گا اور پیار کرے گا۔ ایسے ہی چھ ماہ گزر گئے لیکن میرے بیٹے کے اُٹھنے بیٹھنے اور میرے پیار کے ردعمل میں کوئی خاص جنبش نہیں تھی''۔

کیتھی نے پریشانی سے بات کو بڑھایا:

''اب میں باقاعدہ گھبرا گئی اور ہسپتال میں ڈاکٹروں سے جا کر ملی اور شور مچایا کہ آپ میرے بچے کے بارے میں ٹھیک سے کیوں نہیں بتاتے؟''

اس پر انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ بچے کو سپیشلسٹ ڈاکٹر سے چیک اَپ کے لیے ٹورانٹو لے کر جانا پڑے گا۔ اس کے لیے انہوں نے اپائنٹمنٹ بنا دی تھی۔ میں اپنے خاوند کے ساتھ اگلے ماہ ٹورانٹو چلی گئی۔

سپیشلٹ ڈاکٹر نے بچے کو چیک کیا اور میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے۔

''میرا دل بیٹھنے لگا''۔

یہ کہتے ہوئے کیتھی کے ماتھے پر پسینہ صاف نظر آ رہا تھا۔

میں نے ڈاکٹر سے چیخ کر پوچھا:

''کیا ہوا ہے میرے بیٹے کو''؟

ڈاکٹر نے مجھے کہا:

''آپ پہلے بیٹھ جائیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔''

''میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ میری کیا حالت تھی، کیونکہ مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی

بہت بڑی بات ہے۔

ماؤں کو اپنے بچوں کے بارے میں ان کی حس بتا دیتی ہے کہ ان کے ساتھ کیا اچھا ہے اور کیا غلط ہے''۔

ڈاکٹر نے مجھے بیٹھتے ہی کہا:

''میں آپ کو جو بتانے والا ہوں آپ تحمل سے میری بات سنیں''۔

پھر اس نے بتایا کہ دراصل آپ کے بیٹے کا 'برین فریز' ہو چکا ہے۔ یہ اس وقت ہی فریز ہو چکا تھا جب اس کی پیدائش ہوئی کیونکہ زیادہ دیر لیبر میں انتظار کروانے اور آکسیجن کم ہونے کی وجہ سے بچے کا دماغ منجمد ہو گیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اس کی نقل و حرکت کے معاملات عام بچوں جیسے نہیں ہو سکتے اور یہ باقی زندگی معذوری میں گزارے گا۔ مجھے بہت افسوس ہے یہ کہتے ہوئے' لیکن مجھے آپ کو حقیقت بتانی پڑے گی اور آپ کو یہ تسلیم کرنی ہوگی۔

کیتھی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے جلدی سے ٹشو پیپر سے انہیں صاف کیا۔

وہ دکھ بھری آواز میں کہنے لگی:

''میں وہاں چیخ و پکار کرنے لگی کہ یہ میرے اور میرے بچے کے ساتھ کیا ہو گیا''؟

میں نے ڈاکٹر سے پوچھا:

''اس کا ذمہ دار کون ہے''؟

اس نے کہا:

''ذمہ دار تو ڈیلیوری کے وقت موجود ڈاکٹر ہیں۔ انہی کی غفلت سے بچے کو عمر بھر کی معذوری لاحق ہوئی''۔

کیتھی نے بتایا کہ مجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں نہیں تھا اور میں نے اونچی آواز کہا:

''میں ان کے خلاف عدالت جاؤں گی اور کیس دائر کروں گی کہ ان کی غفلت کی

وجہ سے میرا بچہ عمر بھر کے لیے معذور ہو گیا'

ڈاکٹر نے یہ سن کر ٹھنڈی آہ بھری اور کہا:

''ہونا تو یہی چاہیے کہ ان کی غفلت پر ان کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے مگر میرا نہیں خیال کہ آپ کو اس میں کوئی کامیابی ہوگی کیونکہ اس کے تجربے کے مطابق ہسپتال کی انتظامیہ ڈاکٹروں کے اس عمل کو کسی طریقے سے چھپانے میں کامیاب ہو جائے گی اور ایسی صورتحال میں ان کے خلاف کارروائی نہیں ہو سکے گی۔ دوسرا ہر چیز اتنی تاخیر کا شکار ہو چکی ہے کہ اس کے شواہد دینا مشکل ہوں گے''۔

یہ بتاتے ہوئے کیتھی کی حالت ایک تھکی' ہاری اور مایوس ماں کی سی تھی۔ وہ کچھ اور بولنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ پہلے ہی کرب میں حد سے گزر چکی تھی۔

میں نے اس کی کیفیت اور بے بسی پر رسماً اظہار افسوس کیا اور پوچھا:

''اس کے بعد آپ کے اور بھی بچے ہیں''؟

کیتھی نے بتایا کہ اس کا ایک بیٹا اور بیٹی ہے جو نارمل ہیں لیکن وہ اپنے اس بچے سے بے حد پیار کرتی ہے کیونکہ

''عورت کے لیے پہلی محبت اور پہلا بچہ اتنا اہم ہوتا ہے کہ وہ اس کو ساری زندگی بھلا نہیں پاتی''۔

کیتھی کی باتیں سن کر میں خود بھی افسردہ ہو گیا اور ایک بار پھر سے اظہار ہمدردی کیا۔

''ایک ماں کے لیے یقیناً یہ بہت تکلیف کی بات ہے لیکن قدرت کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔ آپ ماں کی حیثیت سے جس طرح اپنے بیٹے ما کو سے محبت کرتی ہیں میں نے بہت کم ایسا دیکھا کہ ماں اپنے معذور بچے سے اس طرح والہانہ محبت کرے جب کہ وہ ان کے پاس بھی

نہ رہتے ہوں''۔

کیتھی نے میری طرف سے اس اظہار ہمدردی پر شکریہ کہا۔

پھر گویا ہوئی:

''میں آپ کو کیا بتاؤں۔جس دن مجھے اپنے اس بیٹے کے بارے میں پتہ چلا کہ یہ معذور کی زندگی گزارے گا آج 35 سال ہو گئے ہیں میں ایک رات بھی چین کی نیند نہیں سو سکی ہوں۔ دوسرے بچے گھر میں ہونے کے باوجود میرا دل اسی میں لگا رہتا ہے اور میں بہانے سے کوشش کرتی ہوں کہ میں اس کو دیکھ لوں اور مل کر پیار کر لوں۔ایک ماں اور کر بھی کیا سکتی ہے؟''

یہ کہہ کر کیتھی ما کو سے لپٹ کر پیار کرنے لگی اور وہ بھی منہ میں کچھ بول رہا تھا جو صرف کیتھی ہی سمجھ سکتی تھی اور ہم پاس کھڑے ماں بیٹے کے پیار کو صرف دیکھ رہے تھے۔

...18

لکشمن کا تعلق ہندوستان سے تھا۔ کینیڈا آنے سے پہلے وہ انڈین آرمی میں بطور سپاہی بھرتی ہو گیا تھا۔ اس کے پڑوسی اور گہرے دوست اجیت نے اس کو ترغیب دی کہ دونوں مل کر کینیڈا چلتے ہیں۔ وہاں جا کر کام کرتے اور اپنا مستقبل بناتے ہیں۔ اجیت کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں کیا رکھا ہے یہاں کھیتی باڑی کر کے مر جائیں گے۔ لکشمن کی فیملی کی دو مربے زمین تھی اور اس کے دوست کی فیملی ایک مربع کی مالک تھی۔ دونوں بچپن کے دوست اور ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے' اس لیے ان کی دوستی بہت گہری تھی۔

میری ملاقات لکشمن سے اس وقت ہوئی جب وہ ایک فیکٹری سے ریٹائر ہو کر ٹیکسی چلاتا تھا۔

لکشمن سادہ طبیعت نرم گو انسان تھا۔ اپنی کہانی شروع کرتے ہوئے کہنے لگا:

''دونوں دوستوں نے ارادہ تو کیا تھا کہ کینیڈا چلتے ہیں۔ 70 کی دہائی تھی۔ دائیں بائیں کے گاؤں سے ہم سنتے تھے کہ نوجوان بیرونِ ملک جانے کے لیے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ میرے دوست اجیت نے فیصلہ کن انداز میں کہا:''

''ویرے سیدھی سی بات ہے میں نے تو ہر صورت کینیڈا جانا ہی جانا ہے۔ چاہے میرے گھر والے مجھے روکتے رہیں۔ میرا یہاں دل نہیں لگتا اور میں دنیا دیکھنا چاہتا ہوں اور کینیڈا میرے دل میں سمایا ہوا ہے''۔

اجیت اٹل فیصلہ کیے ہوئے تھا۔

اجیت کے رشتے دار ایک بزرگ جو کینیڈا رہ کر آئے تھے اس نے اسے وہاں کی بہترین اور شاندار زندگی کی باتیں بتائی تھیں۔

سچی بات تھی کہ میں بھی ایک اچھے اور گہرے دوست کے طور پر اس کی بات ٹالنا نہیں چاہتا تھا لیکن میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں ایک سال پہلے انڈین آرمی میں اپنے شوق کے تحت بھرتی ہو گیا تھا۔ مجھے کھیلوں کا بہت شوق تھا اور ہاکی کا اچھا کھلاڑی تھا' چونکہ میری تعلیم صرف میٹرک تھی اس لیے میں کھیل کے کوٹے میں آرمی جوائن کر چکا تھا۔ اب ایک طرف میرا دوست اور دوسری طرف انڈین آرمی میں نوکری تھی۔ انڈین آرمی سے اتنی جلدی ڈسچارج لینا ناممکن تھا۔ ہم دونوں نے اس بارے سوچنا شروع کیا کہ آرمی سے میری جان چھوٹے گی تو کینیڈا جا سکیں گے۔

اجیت میرے بغیر کینیڈا جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اب پہلا کام آرمی سے خلاصی کرانا تھا۔ اس کے لیے دو راستے تھے کہ یا تو میں بھگوڑا ہو جاؤں یا پھر کسی طریقے سے ڈسچارج کر دیا جاؤں۔

ہم نے اس بارے ایک ایسے رشتہ دار سے بات کی جو آرمی سے بطور آفیسر ریٹائر ہو چکا تھا۔ اسے بتایا کہ ہمارا یہ پلان ہے میں آرمی سے ڈسچارج ہو جاؤں۔

اس نے ہمیں گائیڈ کیا کہ یہ کام تمہاری یونٹ کا آفیسر کر سکتا ہے اور وہ بھی کرنل رینک کا ہو کیونکہ وہی بااختیار ہوتا ہے۔

اس نے خبردار کیا:

''جتنی تمہاری سروس ہے بہت کم امکان ہے کہ وہ تمہیں ڈسچارج کریں''۔

سوچ بچار کے بعد پلان یہ بنا کہ کرنل کی بیگم تک رسائی حاصل کی جائے۔

یہ 100 فیصد ہوتا ہے کہ آرمی کے آفیسر اپنی بیگمات کی بات نہیں ٹالتے۔ اس بارے مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ آرمی آفیسر اپنی بیگمات سے ڈرتے ہیں جبکہ کچھ لوگ کا کہنا ہے

کہ آرمی آفیسر اپنی بیگمات سے محبت کرتے ہیں۔اس لیے ان کا کہا نہیں ٹالتے۔

اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسی ریٹائرڈ آرمی آفیسر کے ذریعے کرنل کی بیگم تک رسائی حاصل کی تو اس نے وعدہ کرلیا کہ وہ یہ کام کروادے گی۔

پھر وہی ہوا' دو ہفتے کے اندر اندر بیگم صاحبہ کے ذریعے میرے ڈسچارج آرڈر پر سائن ہو گئے۔

بعد میں پتہ چلا کہ بیگم نے صاحب کو شراب پلانے کے بعد ان کا موڈ دیکھا اور ان سے میری درخواست کے بارے میں بات کی تو ایسی صورتحال میں کرنل صاحب کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ بیگم کی بات نہ مانتے اور میرے ڈسچارج آرڈر پر دستخط کر دیے۔آرمی سے ڈسچارج آرڈر ملنے کے بعد میرے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔اب ہم دونوں دوست کینیڈا کے لیے روانہ ہو سکتے تھے۔

لکشمن نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''دوستی بھی کیا چیز ہوتی ہے کہ آپ جو منصوبہ بناتے ہیں اس میں آپ کے والدین' بہن بھائی اور خونی رشتے پیچھے رہ جاتے ہیں۔آپ ان کی کوئی بات سننا گوارا بھی نہیں کرتے۔

یہی کچھ میرے ساتھ ہوا۔میرے ماں باپ نے مجھے روکنے کی کوشش کی کیونکہ ڈسچارج کے پراسس کے دوران انہیں اس بات کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔میرے والد نے مجھے کہا:

''دیکھو پتر۔تم نے اپنی مرضی سے پڑھائی نہیں کی اور سکول سے نکل کر انڈین آرمی میں کھیلنے کے لیے ملازمت ڈھونڈ لی۔ہم چپ رہے اور اب تم ایک بار پھر اپنی مرضی کرتے ہوئے ہمیں چھوڑ کر کینیڈا جا رہے ہو۔سمجھ نہیں آتی کہ ہم تمہیں کیسے روکیں؟''

میرا باپ پریشان ہو کر بولتا چلا گیا:

''میں نے تمہارے دوست اجیت سے بھی بات کی ہے وہ بھی اپنے بہن بھائی سے دور جانا چاہتا ہے۔اس کے والدین بھی دکھی ہیں' لیکن میں ایک بات تم کو بتا دوں کہ تمہیں اس وقت معلوم ہوگا جب تم خود باپ بنو گے کہ جس طرح تم اس وقت خود غرضی کو سمجھ نہیں پا رہے۔اسی طرح کل کو تمہاری اولاد بھی تمہیں یہ احساس دلا سکتی ہے''۔

میرے والد کی یہ باتیں میری ماں بھی سن رہی تھی۔وہ رو رہی تھی لیکن مجھے رو کنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔میں ان کے چہرے پر غم اور دکھ کے واضع آثار دیکھ رہا تھا لیکن صحیح معنوں میں مجھے اس بات کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

میرے تو دماغ پر اپنے دوست کے ساتھ کینیڈا جانے کا بھوت سوار تھا۔

آخر وہ دن آ گیا جب ہم نے تیاری مکمل کر لی اور گھر والوں سے رخصت ہو رہے تھے۔وہ منظر مجھے اب بھی یاد ہے کہ میرے اور اجیت کے گھر والے ہمارے جانے پر خوش نہیں تھے اور ایک انجانے خوف کا شکار تھے کہ ہم ان سے دور جا رہے ہیں۔

میرے دوست کے والد اور ایک بھائی اسے چھوڑنے ایئرپورٹ آئے' لیکن میرے والد والدہ اور بہن بھائیوں نے مجھے گھر سے ہی الوداع کر دیا تھا۔

دلی سے جہاز میں بیٹھنے کے بعد لگا کہ ساری خوشی جاتی رہی ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ جہاز کے اندر بیٹھے ہیں اور گھر والوں سے دور ایک انجانی منزل کی طرف روانہ ہونے والے ہیں۔جہاز میں بیٹھنے کے ساتھ مجھے گھبراہٹ شروع ہو گئی اور میں نے اپنے دوست سے کہا:

''میری طبیعت خراب ہو رہی ہے''۔

اس نے ائیر ہوسٹس کو بلایا اور کہا کہ میرے دوست کی طبیعت خراب ہو رہی ہے اس کے لیے کچھ کریں تو اس نے پوچھا:

''کیا یہ آپ کا پہلا سفر ہے''؟

میں نے بتایا:

''ہاں''

وہ بولی:

'' فکر کی کوئی بات نہیں۔ ایسا ہوتا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں آپ پریشان ہیں۔ ایک گولی دیتی ہوں وہ کھالیں گے تو بہتر محسوس کریں گے''۔

اس نے مجھے گولی اور پانی دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس گولی میں کوئی اثر تھا یا نہیں لیکن میں آنکھیں بند کر کے بہت دیر تک سیٹ کے ساتھ اپنا سر ٹکا کر یہ کوشش کرتا رہا کہ مجھے کوئی خیال اور میرے گھر والے یاد نہ آئیں۔ اس دوران میری آنکھ لگ گئی اور مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ مجھے تب پتہ چلا جب اجیت نے مجھے کہا:

''لکشمن اُٹھ جا' کھانا کھالے''۔

میرا کھانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں نے زہر مار کر لیا۔ کھانے کے دوران میرا دوست مجھے تسلی دینے اور میری دل جوئی کی کوشش کرتا رہا۔

کہنے لگا:

''آگے ہمارے لیے بہتر منزل انتظار کر رہی ہے ہمت کرو''

دراصل میرا دوست سکول کے بعد کالج داخل ہو گیا تھا اور اسے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔

کینیڈا کا سفر کرنے کا ارادہ اس نے نہ صرف اپنے رشتہ دار سے اچھی باتیں سننے کے بعد کیا تھا بلکہ کچھ کتابیں پڑھنے کے بعد اس کا اشتیاق اس حد تک بڑھ گیا کہ وہ کینیڈا جانے کے لیے دیوانہ ہو گیا۔

اجیت مجھے کہا کرتا تھا:

''یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ زندگی میں سفر وسیلہ ظفر اس لیے ہوتا ہے کہ سفر سے دوسرے علاقوں کے بارے میں جانتے اور سیکھتے ہیں۔ آپ کی زندگی میں

بہتری اور کامیابیاں ایسے ہی سفر کے ذریعے آتی ہیں تو کیوں نہ کینیڈا جیسا لمبا سفر کیا جائے۔''

ہماری پہلی منزل برطانیہ تھی جہاں ہمیں کئی گھنٹے قیام کے بعد اگلی فلائٹ سے کینیڈا پہنچنا تھا۔

چونکہ ہماری ٹکٹ کینیڈا کے لیے تھی اس لیے ہم ہیتھرو ایئرپورٹ کے اندر ہی بیٹھے رہے اور اگلی فلائٹ سے کینیڈا کے شہر ٹورانٹو پہنچ گئے۔

کینیڈا میں ان دنوں ہندوستان کے علاوہ دیگر ملکوں سے بھی نوجوان لوگ چلے آتے تھے۔ امیگریشن پر عام طور پر یہی کہنا پڑتا تھا کہ ہم یہاں سیر کے لیے آئے ہیں۔ وہ آپ سے پوچھتے کہ کتنی رقم ساتھ لائے ہو؟

اس زمانے میں کینیڈا بہت سستا ہوا کرتا تھا۔ ایک ڈالر میں بہت کچھ آ جاتا تھا۔ کینیڈین امیگریشن کے حکام باہر سے آنے والے جو بھی کہتے ان کی بات پر یقین اور اعتبار کرتے تھے۔ امیگریشن پر ہمیں زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور ہم دونوں کے پاسپورٹ پر انٹری دے دی گئی۔ ہم چونکہ طے کر کے آئے تھے کہ یہاں اپنے آپ کو سیٹ کرنا ہے اس لیے موسم اور کام کی سختی کو برداشت کرنے کے لیے تیار تھے۔

ایئرپورٹ سے باہر نکل کر ٹیکسی لی اور اس پنجابی ڈرائیور کو بتایا کہ ہم نے اس ایڈریس پر جانا ہے۔

یہ ایڈریس دراصل میرے دوست کو اس رشتہ دار نے دیا تھا جو کینیڈا میں ایک عرصہ تک رہ کر ہندوستان واپس گیا تھا۔ یہ ایک ہندوستانی شخص کا گھر تھا جہاں وہ کرائے پر کمرے دیا کرتا تھا۔ ٹیکسی والے کو ہم نے بتایا کہ ہم نئے ہیں اور ظاہر ہے ہمیں کام کی بھی ضرورت ہوگی تو اس نے جھٹ سے اپنا نمبر دے دیا اور کہنے لگا:

''میں جانتا ہوں کہ بعض فیکٹریوں میں ہر وقت ملازموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کچھ دن ریسٹ کرو کیونکہ لمبے سفر سے آئے ہو۔ اس کے بعد مجھے

فون کرنا میں تمہارے لیے فیکٹری میں کام کا بندوبست کروادوں گا۔

جب میں کئی سال پہلے کینیڈا میں نیا آیا تھا تو میرے ساتھ بھی ایک ٹیکسی والے نے بھلائی کی تھی اور مجھے جاب لے کر دی تھی تو میں سمجھ سکتا ہوں کہ نئے آنے والے کا کیا مسئلہ ہوتا ہے۔ میں نئے آنے والوں کے لیے کام ڈھونڈنے میں مدد کر کے خوشی محسوس کرتا ہوں''۔

ٹیکسی والے بھائی نے اپنے دل کی بات کر دی۔

جاتے جاتے پھر کہنے لگا:

''کام کا کیا ہے جلد بدیر ہر کسی کو مل جاتا ہے لیکن اگر میرے ذریعے کسی کی جاب لگ جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کوئی اچھا کام کیا ہے اور میرا دل مطمئن ہو جاتا ہے''۔

تیسرے دن ہم نے مالک مکان کے ذریعے فون کیا تو وہ آ گیا ہے اور ایک فیکٹری کے باہر جا کر اس نے گاڑی روکی اور ہمیں ساتھ اندر لے جا کر گورے سپر وائزر سے ملا۔ انگلش میں بتایا:

''ہم نئے آئے ہیں اور کام کی ضرورت ہے۔ محنت سے کام بھی کرنا جانتے ہیں''۔

ہارڈ ورکنگ گائز' گورے نے ہمیں ویلکم کہا اور مسکرا کر ہم سے ہاتھ ملایا اور اگلے دن کام پر آنے کا کہہ دیا۔ ہم دونوں میں سے میری انگریزی کچھ خاص نہیں تھی لیکن اجیت مناسب انگریزی بول اور سمجھ سکتا تھا۔

فیکٹری میں مجھے سپر وائزر کے بولنے کی کوئی سمجھ نہیں آتی تھی۔ مجھے اجیت سے پوچھنا پڑتا تھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے اور مجھے کیا کرنا ہے؟ فیکٹری میں مزدوری کا کام ہمیں دیا گیا تھا' کبھی وزن اٹھاتے تو کبھی پیکنگ کرتے تھے۔ نوجوان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ فیکٹری میں آدھے ہندوستان اور باقی دیگر ملکوں سے آئے ہوئے لوگ کام کرتے تھے۔ ہر ایک کا اپنے کام پر دھیان ہوتا تھا صرف

بریک کے دوران ایک دوسرے سے بات چیت ہوتی تھی۔ فیکٹری میں کام کرتے ہوئے دو ماہ گزرے تھے کہ ہمیں ایک ساتھی ورکر نے بتایا کہ آپ لوگوں کو اپنا وزٹ ویزہ ورک ویزا میں بدلنے کے لیے وکیل کرنا ہوگا تاکہ آپ لوگ یہاں پر قانونی طریقے سے کام کریں اور آگے پکے ہونے کے لیے بھی راستہ بن جائے۔

اس نے ہمیں ایک پنجابی وکیل اور اس کی فیس کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ آپ کا کام لازمی کروادے گا کیونکہ اس کا کام بھی اسی وکیل کے ذریعے ہوا ہے۔ ہمارے پاس وکیل کو دینے کے لیے پوری رقم تو نہیں تھی لیکن جب ہم وکیل سے ملے تو وہ تیار ہو گیا کہ آدھی فیس اب دے دیں 500 ڈالر اور آدھی بعد میں جمع کر کے دے دینا۔ ہمارے لیے ایک طرح سے بھگوان نے آسانی پیدا کر دی تھی۔

چھ مہینے بعد ہمارے کیس کی سماعت ہوئی اور گورے آفیسر نے کچھ کاغذات جو ہمارے وکیل نے بنائے تھے۔ اس نے ہمیں اس بارے میں پہلے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ ہم نے آفیسر کو پوچھنے پر کیا بتانا ہے۔ آفیسر جلدی ہی مطمئن ہو گیا اور اس نے ہمارے کاغذات منظور کر لیے۔ کینیڈا میں اپنے اسٹیٹس کے کنفرم ہونے پر ہم دونوں دوست بہت خوش تھے۔ ہم نے اپنے دوست اور وکیل کے ساتھ ایک پارٹی بھی کی۔ اس دوران گھر والوں سے ہمارا رابطہ ہوتا رہتا تھا اور میرے ماں باپ یہی پوچھتے تھے کہ تم خوش تو ہو؟ تم نے کھانا کھایا ہے؟ ماں کہتی:

''تم ہمیں بہت یاد آتے ہو لیکن کیا کریں تم اتنی دور چلے گئے۔''

یہ سن کر میں دکھی بھی ہو جاتا تھا لیکن اب تو میں اتنی دور آ چکا تھا۔

بالکل ایسے ہی جیسے کوئی انڈے سے نکلنے والا پرندے کا بچہ گھونسلے سے گر جائے تو وہ دوبارہ گھونسلے میں کبھی نہیں جا پاتا اور اپنے لیے گھونسلے کے باہر ہی زمین پر راستے تلاش کر لیتا ہے، یہی کچھ میرے ساتھ ہونے جا رہا تھا۔

فیکٹری میں کام کرتے ہوئے دو سال گزر گئے تو ہمارے پاس اچھی خاصی رقم جمع

ہوگئی تھی۔اب ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ سخت سردی کا موسم گزرتے ہی واپس ہندوستان جائیں گے۔ اپنے گھر والوں سے ملیں گے کیونکہ کینیڈا کے سخت سرد موسم نے ہمیں پریشان کر دیا تھا۔ ہمارے ذہن میں نہیں تھا کہ اس قدر شدید سردی اور برف باری ہوگی، بعض اوقات سردی نا قابل برداشت ہو جاتی تھی لیکن ہم نے دیکھا کہ سخت موسم میں بھی کینیڈا میں زندگی چلتی رہتی ہے اور ہر ایک کو کام کے لیے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ہم بھی اس نظام اور ماحول کا حصہ بن کر رہ گئے تھے۔

چونکہ پکے پیپر ہمارے ہاتھ میں آ گئے تھے اس لیے ہم نے ٹکٹ لی اور ایک مہینے کے لیے فیکٹری سے چھٹی لے کر ہندوستان پہنچ گئے۔گھر والوں سے ملے تو معلوم ہوا کہ وہ بہت اداس رہے ہیں اور ہمارے واپس آنے پر کس قدر خوش ہیں، خاص طور پر میرا باپ اور میری ماں جن کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔اجیت بھی جب اپنے ماں باپ سے ملا تو اسے بھی احساس ہوا اس کی جدائی میں ماں باپ کس کرب سے گزرے ہیں وہ بیان نہیں کر سکتے تھے۔ ہندوستان میں ہمارے قیام کے دوران رشتہ داروں اور دوستوں سے ملنا ملانا چلتا رہا اور سب بڑے پیار اور خوشی سے ملتے تھے کہ ہم دونوں کینیڈا میں مستقل شہریت لے چکے ہیں۔ان میں سے بعض میرے کان میں کہتے:

''یار ہمارے لیے بھی کوشش کرنا ہم بھی کینیڈا چلے جائیں۔''

کئی بڑوں نے بھی مجھے علیحدگی میں لے جا کر کہا کہ ان کے بیٹے کے لیے بھی کوئی وہاں کام ڈھونڈو تا کہ وہ بھی وہاں جا کر اپنا مستقبل بنا سکیں۔

ہمارے واپس جانے میں ایک ہفتہ تھا کہ ایک ناگہانی صورتحال کا سامنا کرنا پڑ گیا۔میرا دوست اجیت اپنی گلی میں پیدل جا رہا تھا کہ پیچھے سے آنے والے ایک بے قابو ٹریکٹر نے اسے کچل دیا اور اپنے گھر کے سامنے اس قدر زخمی ہوا کہ ہسپتال لے جانے سے پہلے ہی دم توڑ گیا۔

اس کے گھر والوں کے علاوہ اس المناک موت کا مجھ پر بہت گہرا صدمہ ہوا

اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو یا۔ ایک پیارے دوست کی ایسی موت میرے تصور میں بھی نہ تھی۔

میرا دل بجھ گیا۔ اجیت کا چہرہ' برسوں کا یارانہ اور بھائیوں جیسا پیار اور محبت رہ رہ کر ستانے لگی تھی۔ میں اس کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا اور نہ ہی اجیت کے والدین کا سامنا کر پا رہا تھا۔ وہ جس قدر غم زدہ اور نڈھال تھے میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں واپس جاؤں۔

واپس جانے میں کچھ دن ابھی باقی تھے اور میں اجیت کے والدین سے کہہ چکا تھا کہ میں کینیڈا واپس نہیں جانا چاہتا تو وہ خاموش ہو گئے تھے۔

دو دن پہلے اجیت کے والدین نے مجھے بلوایا اور میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور روتے ہوئے کہنے لگے:

''تمہارا دوست تو چلا گیا اس دنیا سے اور وہ واپس بھی نہیں آ سکتا۔ ہم تمہیں جب دیکھتے ہیں تو ہمیں بیٹا یاد آ جاتا ہے' بہتر ہے ہماری عرضی مانو' تم کینیڈا واپس چلے جاؤ۔ اس کی تو اتنی ہی زندگی تھی لیکن تم تو اپنی آنے والی زندگی اور مستقبل کا خیال کر لو' ہمیں اس سے ہی خوشی ملے گی کہ تم زندہ سلامت کینیڈا میں اپنا مستقبل بنا رہے ہو۔''

میرے والدین نے بھی مجھے دکھی دیکھ کر میری دل جوئی کی اور مجھے واپس جانے پر آمادہ کر لیا۔ میں بہت بوجھل دل کے ساتھ دوبارہ جہاز میں بیٹھا اور کینیڈا پہنچ گیا۔

سچ پوچھیں تو اب فیکٹری میں کام پر میرا دل نہیں لگتا تھا لیکن میرے دوسرے ہندوستانی ورکرز نے جب اجیت کی موت کے بارے میں سنا تو انہوں نے کوشش کی کہ میں اس کی موت کے غم سے نکل سکوں اس لیے وہ میرا خیال رکھتے تھے۔

''غم بھی کیا چیز ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شدت کم ہوتی جاتی ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ ہم اپنے پیاروں کو بھول جاتے ہیں اور زندگی اسی طرح

رواں دواں رہتی ہے جس طرح غم کے آنے سے پہلے تھی''۔

یہ کہتے ہوئے لکشمن کی آنکھیں تر ہو گئیں۔

دو سال بعد میں دوبارہ ہندوستان آیا اور اپنے ماں باپ سے وعدہ کے مطابق ان کی پسند کی لڑکی سے شادی کر لی۔ ایک مہینہ رہ کر دوبارہ کینیڈا چلا گیا اور وکیل کے ذریعے میں نے اپنی بیوی کا کیس فائل کر دیا۔ چار ماہ بعد میری بیوی بھی کینیڈا پہنچ گئی۔ میری بیوی بھی فیکٹری میں میرے ساتھ کام کرنے لگ گئی تو ہم نے زندگی کے سفر کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ ہمارا سپنا تھا کہ ایک دن اپنا گھر خرید لیں گے۔

یکے بعد دیگرے ہمارے گھر دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئے۔ فیکٹری میں ایک دن میرے سپروائزر نے مجھے بلایا اور پوچھا:

''تم سپرے پینٹر کا کام کرنا چاہتے ہو''؟

''جی کرلوں گا''۔

میں نے فوراً جواب دیا۔

ہوا یہ تھا کہ فیکٹری کا سپرے پینٹر جو پروفیشنل ورکر تھا' اچانک کام چھوڑ گیا تو سپروائزر کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ کسی اور کو اس ملازمت پر رکھے یا فیکٹری کے ہی کسی ملازم کو یہ کام سکھا دے۔ میری خوش قسمتی کہ اس نے مجھے یہ پیشکش کی۔ میں کبھی لیٹ نہیں ہوا تھا اور چھٹی بھی نہیں کرتا تھا شاید اسی لیے سپروائزر مجھے ذمہ دار ورکر سمجھتا تھا۔ چند ہفتوں میں مَیں نے یہ کام سیکھ لیا۔ یوں میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہو گیا۔ میری بیوی بچوں کی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھی اور بچے جب سکول جانا شروع ہوئے تو بیوی نے دوبارہ پارٹ ٹائم کام شروع کر دیا۔

تینوں بچوں کے لیے ہمیں گورنمنٹ سے بینیفٹ بھی مل جاتا تھا۔ جس سے ہم نے اچھی خاصی بچت کر کے گھر بھی لے لیا اور گھر کے مالک بن گئے۔ سکولوں میں پڑھنے والے بچوں کے ساتھ ہمارے بچے بھی پارٹ ٹائم جاب کرنے لگے تھے اور اپنا جیب

خرچ بنا لیتے تھے۔

لکشمن کہنے لگا میں نے اپنے بچوں کو بہت عیش کروائی ہے۔

''کیسی عیش؟'' اس سوال پر کہنے لگا:

''اپنے بچوں کو ہر ہفتے باہر لے کر جاتا تھا۔ دیگر بچوں کی طرح انہیں بھی برگر اور فرائز پسند تھے۔''

بعد میں بچے جب ہائی سکول میں پہنچے تو انہوں نے میکڈونلڈ پر سٹوڈنٹ جاب حاصل کر لی اور پھر وہاں مینجر کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔

لکشمن کہنے لگا کہ وہ فیکٹری سے سپرے پینٹر کے طور پر ریٹائر ہوا لیکن اس سے پہلے مجھے اپنے ایک دیسی ورکر نے بتایا کہ ٹیکسی کا لائسنس مل رہا ہے اور اس کے لیے کچھ خاص فیس بھی نہیں ہے۔ میں نے اس کے لیے اپلائی کر دیا اور مجھے ٹیکسی کا لائسنس مل گیا تو میں فیکٹری سے آنے کے بعد پارٹ ٹائم ٹیکسی بھی چلایا کرتا تھا۔ فیکٹری کے کام سے ریٹائرمنٹ کے بعد مجھے کام کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور میں ٹیکسی سے آمدن حاصل کرنے لگ گیا تھا۔ میری بیوی ایک لانڈری شاپ میں کام کرتی تھی اور شام کو گھر آ کر بچوں کے لیے کھانا پکاتی اور دیگر کام کاج کرتی تھی۔ سچ پوچھو تو بیوی نے میرا بہت ساتھ دیا۔

دو تین سال کے بعد جب ہمارے پاس اتنی رقم جمع ہو جاتی کہ ہم ہندوستان کا سفر کر سکیں تو ہم اپنے والدین کے پاس جا کر ایک مہینہ رہ آتے تھے۔ اس سے ان کا دل بھی خوش ہو جاتا تھا' لیکن یہ اس وقت ہی ممکن تھا جب بچے چھوٹے تھے جب وہ بڑی کلاسز میں گئے تو یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں اور میری بیوی دو سال بعد ہندوستان جا کر رہتے اور اپنے ماں باپ کے علاوہ تمام رشتہ داروں سے ملتے تھے۔

لکشمن نے اپنے بچوں کے متعلق بتایا کہ انہوں نے یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی۔ ایک بیٹی نے پی ایچ ڈی تک تعلیم حاصل کی اور دوسرے شہر میں سرکاری عہدے پر

کام کر رہی ہے۔اس کی شادی چل نہیں سکی اور اب وہ اور کرنا بھی نہیں چاہتی۔ایک بیٹا دوسرے شہر میں اپنا کاروبار کرتا ہے اور اس کے بچے بھی ہیں' جبکہ ایک بیٹا اسی شہر میں ایک مالیاتی ادارے کے ہیڈ آفس میں کام کرتا ہے۔لکشمن نے بتایا کہ کرسمس کے موقع پر بچے اپنی فیملی کو لے کر ہمارے پاس آتے ہیں اور چند دن گزار کر چلے جاتے ہیں اور ہم بھی خوش ہو جاتے ہیں۔جب لکشمن سے پوچھا کہ اسی شہر میں موجود بیٹے سے آخری ملاقات کب ہوئی؟

تو وہ خاموش ہو گیا اور قدرے توقف کے بعد کہنے لگا:

''اس کا یہ بیٹا بھی شادی شدہ ہے اور ایک سال سے ملا نہیں تھا' شاید اس نے بھی کوشش نہیں کی نہ ہی فون پر رابطہ کیا۔

ایک دن مجھ سے نہیں رہا گیا اور میں اس کے آفس چلا گیا۔وہاں اس کے اسسٹنٹ نے آنے کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا:''

''بس میں نے آپ کے باس سے ملنا ہے''۔میں نے اسے یہ ہرگز نہیں بتایا کہ وہ میرا بیٹا ہے۔اس نے میرا نام چٹ پر لکھ کر اندر دے دیا اور باہر آ کر بتایا کہ جب وقت ہوگا وہ آپ کو بلا لیں گے۔

''پھر کیا ہوا ملاقات ہوئی؟''

اس سوال پر لکشمن نے سر جھکا لیا اور آہستہ سے بولا:

''نہیں میں وہاں دو گھنٹے بیٹھا رہا اور خود ہی اٹھ کر واپس آ گیا کہ اس نے ملنے کے لیے نہیں بلایا''۔

اس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی اور اس سے پہلے کہ کچھ کہتا' لکشمن خود ہی بول پڑا:

''دراصل وہ بہت بزی (مصروف) ہوتا ہے۔مجھے اس بات کا احساس ہے اس لیے میں وہاں سے دو گھنٹے انتظار کے بعد خاموشی سے چلا آیا کہ چلو اس کو یہ تو پتہ چلا کہ میں اسے ملنے آیا تھا۔''

لکشمن کی بیٹی بھی فلائٹ کی عدم دستیابی کی وجہ سے کرسمس پر نہ آسکی تھی تو وہ بیوی کے ساتھ خود ہی دوسرے شہر کلونا بیٹی کے ہاں چلا گیا۔ بیٹی اپنے ماں باپ کو ایک مہنگے ریسٹورنٹ میں کھانے پر لے گئی۔ جہاں اس نے دوسو ڈالرز بل ادا کیا تو لکشمن کو اچھا نہیں لگا اور بیٹی کو کہا:

''کیا ضرورت تھی اس قدر مہنگے ریسٹورنٹ میں آنے کی۔ گھر میں جو پکتا کھا لیتے۔''

لکشمن نے بتایا کہ وہ بیٹی کو ہر ماہ پانچ سوڈالر بھیجتا ہے۔

جب پوچھا کہ وہ ڈالر کیوں بھیجتا ہے؟ تو اس نے بتایا:

''یہ بھی درست ہے کہ اسے رقم کی ضرورت نہیں لیکن وہ اس کو بیٹی (دھی دھیان) سمجھ کر رقم بھیجتا ہے کہ ماں باپ کو بیٹیوں کو محبت کے طور پر کچھ نہ کچھ دینا چاہیے اور میں اسی لیے یہ رقم بھیج کر اپنے اندر خوشی محسوس کرتا ہوں''۔

لکشمن کے بیٹی کو رقم بھیجنے اور بیٹی کے والدین کو ریسٹورنٹ میں ڈنر کے لیے لے جانے پر نئی اور پرانی نسل کی سوچ و خیالات اور اخراجات کے انداز میں واضح فرق کو آج کے کینیڈا میں خوب دیکھا جا سکتا ہے۔

...19

اس سٹور پر کام کے دوران ابتدائی دنوں میں مَیں یہ سمجھتا رہا کہ کینیڈا میں جو بھی کمپنی سیلز مین سپلائی دینے آتے ہیں۔جن میں چپس کے پیکٹ اور سوڈا کی بوتلوں سمیت دیگر کھانے پینے کی اشیاء شامل تھیں آرڈر کے مطابق بالکل ایمانداری سے سپلائی کرتے ہیں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ کمی بھی کر سکتے ہیں۔ایک دن مجھے سٹور مینجر نے ایسے ہی باتوں باتوں میں کہا کہ آپ ان سپلائی دینے والے سیلز مین کا خیال رکھا کریں کہ یہ چیزیں کم بھی دے جاتے ہیں اور ہمیں چونا لگاتے ہیں۔ جب سٹور کی سیل اور سٹاک کا آڈٹ ہوتا ہے تو شارٹیج کی مد میں ہزاروں ڈالر ہماری جیب سے جاتے ہیں۔ اس نے مجھے محتاط رہنے کے لیے کہا تو میں پریشان ہو گیا کہ کینیڈا میں ایسا بھی ممکن ہے۔

میرا گمان کچھ اور ہی تھا۔خیر اب میری جاب یہ تھی کہ میں صبح کے وقت سپلائی دینے کے لیے آنے والے معروف کمپنی کے ڈرنکس اور چپس وغیرہ کی بل میں تعداد اور سپلائی پر نظر رکھوں۔ یہ سپلائی عام طور پر ہر ہفتے ہوتی تھی کیونکہ سٹور مینجر ضرورت کے مطابق آن لائن یہ آرڈر کیا کرتے تھے جس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا۔

مینجر کی ہدایت کے بعد میں اس کوشش میں تھا کہ دیکھوں کہ یہ کس طرح چوری کرتے ہیں۔اس بار سپلائی میں جب سیلز مین اپنی باہر کھڑی گاڑی سے چپس کے چھوٹے بڑے پیکٹ لے کر آیا۔اس نے میرے سامنے آرڈر شیٹ رکھی تو میں نے اس کو کہا:

''ایک منٹ ٹھہرو؛ میں ابھی اس کو چیک کرتا ہوں''۔

کیونکہ اس وقت میں گاہک کو ڈیل کر رہا تھا۔سیلز مین بڑے اطمینان سے میرا کچھ منٹ تک انتظار کرتا رہا۔آرڈر میں لیز کے پانچ بڑے پیکٹ لکھے ہوئے تھے۔جب

میں نے سپلائی باکس میں دیکھا تو وہاں تین پڑے ہوئے تھے۔ میں نے جب چھوٹے پیکٹ آرڈر کے مطابق چیک کیے تو وہ 15 کی بجائے 12 تھے۔ اس بارے میں جب میں نے اس کو بتایا کہ تم شارٹ سپلائی لے کر آئے ہو تو اس نے ''اوٗ سوری'' کہہ کر یوں ظاہر کیا کہ جیسے وہ اچانک یہ کام کر گیا ہے۔ میں نے بھی ظاہر کیا کہ ہو جاتا ہے کوئی بات نہیں تو وہ جلدی سے باہر جا کر گاڑی سے بقیہ پیکٹ بھی اٹھا لایا۔ اتنی دیر میں مَیں نے باقی سامان کو چیک کیا ہے تو وہ پورے تھے۔ اسی سیلز مین کا کام ہوتا ہے کہ وہ ان پیکٹس کو مقررہ سیکشن میں ڈسپلے کر دے۔ میں دیگر ضروری کاموں میں مصروف ہو گیا کیونکہ مینیجر کے شفٹ پر آنے سے پہلے مجھے بقیہ معمول کے کام نمٹانے تھے' لیکن ساتھ ساتھ میں سوچتا رہا کہ کینیڈا میں ایسی چوری کا پہلے سنا تھا نہ کسی نے بتایا۔ یہ کہہ سکتے تھے ''کمال ہے ویسے' چور کہاں نہیں پائے جاتے''۔

مینیجر کے آنے پر میں نے رپورٹ کیا کہ آپ سچ کہتے تھے کہ یہ سیلز مین چوری کرتے ہیں۔ آج میں نے اس کی کوشش ناکام بنا دی ہے۔ میں نے مینیجر سے گلہ کیا کہ آپ نے مجھے اس بارے خود ہی تاخیر سے بتایا کہ ان کا دھیان رکھنا ہے کہ چیزیں کم نہ دے کر جائیں۔ مینیجر نے کہا یہ بہت چالاک اور ظالم ہیں اور ہیرا پھیری کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ چلیں کوئی بات نہیں پہلے جو چوری کر چکے' آئندہ خاص خیال رکھیں۔

اس سیلز مین کی چوری تو الگ تھی سٹور میں خریداروں کی شکل میں بچے اور بڑے اشیاء چرا کر نکل جاتے تھے۔ سٹور سے نکلنے کے بعد آپ ان کا پیچھا بھی نہیں کر سکتے تھے جو سب سے بڑی مصیبت تھی۔ ایک دن سٹور مینیجر کے بھائی نے بتایا کہ اس نے وہیل چیئر پر ایک معذور عورت اور اس کے ہیلپر کو کافی سارے چپس کے پیکٹ ساتھ لٹکائے بیگ میں ڈال کر بغیر ادائیگی نکلنے کی کوشش میں سٹور کے دروازے پر روک لیا اور پوچھا کہ تم اس کی پیمنٹ کرو گے؟ انہوں نے جواب میں کہا:

''نہیں''۔

میں نے ان کو کہا:

'' پھر تم نے یہ سامان کیوں بیگ میں ڈالا ہے اگر پے منٹ نہیں کرنی۔ مطلب چوری کر رہے ہو۔ چلو واپس رکھو وہیں پر جہاں سے سامان اٹھایا تھا''۔

انہوں نے پکڑے جانے پر تمام پیکٹس واپس رکھے اور واردات ناکام ہونے پر باہر نکل گئے۔ سٹور مینجر کے بھائی نے بتایا کہ ان پر شک تھا کہ یہ پہلے بھی کئی بار چوری کر کے نکل گئے تھے۔

اگلے ہفتے وہی سیلز مین الصبح اپنے ڈیلیوری ٹرک کے ساتھ آیا تو میں تیار تھا کہ آج یہ کوئی حرکت کرتا ہے یا نہیں؟

ہاتھ میں آرڈر سیٹ اور ٹرالی پر چپس کے پیکٹ رکھے اندر داخل ہوا اور با آواز بلند گڈ مارننگ کہتا ہوا کاونٹر پر پہنچا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے آرڈر شیٹ پکڑی اور جب پیکٹ گنے تو اس بار بھی بڑے چھوٹے پانچ پیکٹ کم تھے۔

میں نے اس سے پوچھا:

''تم آرڈر ہمیشہ کم تعداد میں لاتے ہو؟''

اس نے پھر سوری کہتے ہوئے ایسے تاثر دیا کہ وہ علیحدہ رکھنے کے باوجود ٹرک میں ہی بھول آیا ہے کیونکہ وہ جلدی میں بھی تھا وغیرہ وغیرہ۔

وہ پیکٹ لے کر دوبارہ ادھر آیا اور اس نے گنتی پوری کر دی۔ میں نے اس کو ادھر ہی روک لیا اور پوچھا:

''یہ بتاؤ کہ یہ کام تم کتنے عرصے سے کر رہے ہو''۔

تو چہرے سے وہ گھبرایا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔

اس نے جواب دیا:

''ایک سال سے''۔

میں نے اس سے پھر پوچھا:

''تم گزشتہ کئی ماہ کے دوران اسی طرح شارٹ سپلائرز دیتے پھر رہے ہو؟''

اس نے جواب میں کہا

''ایسا غلطی سے ہوا ہے''۔

میں نے اس کو یاد دلایا کہ اس نے گزشتہ ہفتے بھی یہی حرکت کی تھی۔

میں نے اس پر چڑھائی کر دی

''آئندہ یہ چالاکی یہاں پر کرنے کی کوشش کی تو تمہاری رپورٹ کر دوں گا کہ تم عادی چور ہو''۔

جواب میں وہ کچھ بڑبڑایا اور جا کر شیلف پر فلنگ کرنے لگا۔ اس سے پہلے وہ فارغ ہو کر وہ اپنے کپ میں فری کافی لے جاتا تھا۔ اس بار میں نے اس کو روک دیا کہ تم اگر کافی کی پے منٹ کرو گے تو لے لو مفت کی ہرگز اجازت نہیں۔ اس پر وہ منہ لٹکائے باہر نکل گیا۔

کینیڈا میں اس شخص کی چوری کا یہ سارا ماجرہ دیکھ مجھے لاہور کے ایک بڑے ہسپتال میں ملازم جہانگیر یاد آ گیا۔ جو درجہ چہارم کی سرکاری ملازمت سے پہلے آئس کریم وین کے ساتھ ڈیلیوری کا کام کرتا تھا۔ ایک دن موج میں بیٹھا ہوا کہنے لگا:

''آئس کریم کی ڈیلیوری کرتے ہوئے وہ ہر دکان کی فریج میں آئس کریم فلنگ کے دوران ہیرا پھیری ضرور کرتے تھے۔

''بظاہر ایسا لگتا تھا کہ ہم نے فریج کو فل کر دیا ہے لیکن اس میں سے ہم اچھی خاصی پھٹی لگا لیا کرتے تھے''۔

جہانگیر کا کہنا تھا:

''اگر کوئی دکاندار زیادہ چالاک نکلتا اور وہ فریج فلنگ کے دوران ہمیں چیک یعنی نگرانی کرتا تو ہم خالی ڈبوں میں آنکھ بچا کر اس کا کوئی گھی کا ڈبہ یا

کوئی اور مہنگی آئٹم ڈال کر اٹھا لیتے تھے''۔

اس نے بڑے فخر سے کہا:

''ایسا بہت کم ہوتا کہ ہم کسی سٹور سے چوری نہ کر سکیں''۔

کینیڈا میں سٹور پر ڈیلیوری کے دوران سیلز مین کی چالاکی اور مسلسل چوری کو دیکھ کر مجھے جہانگیر کی وہ باتیں اور طریقہ واردات یاد آ گیا جو وہ پاکستان میں استعمال کرتا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ انسان تو ہر جگہ ایک جیسے ہیں اور ان کے ذہن میں مخفی منفی رجحانات کہیں بھی اور کبھی بھی سامنے آ سکتے ہیں۔

...20

میرا نام ایڈم ہے اور میں یوکرین میں پیدا ہوا۔ آج سے 10 سال پہلے میں کینیڈا آیا تھا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ یوکرین میں میری پرورش ایک عیسائی گھرانے میں ہوئی اور بچے کے طور پر میرے والدین مجھے چرچ لے کر جایا کرتے تھے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ چرچ میں پادری کے وعظ میں اس بات کا تذکرہ کیا جاتا تھا کہ جس شخص کا جتنا رنگ گورا ہوگا وہ اتنا ہی خدا کے قریب ہوگا اور خدا اپنے مقرب لوگوں کو جنت میں پہلے داخل کرے گا۔ بچے کے طور پر بھی مجھے اس کی بات کبھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ جسمانی رنگت کی بنیاد پر تفریق کا یہ درس کیونکر ہے۔ جیسے جیسے میں بڑا ہوا تو مجھے اس کے بارے میں تجسس ہوا کہ سفید رنگ کا خدا کے قریب ہونے سے کیا تعلق ہے؟ لیکن مجھے اس کی کوئی خاص دلیل یا وجہ نہیں ملی' کیونکہ خدا نے ہر بچے کو فطرت پر پیدا کیا ہے اور وہ معصوم ہوتا ہے اور اگر وہ گورے رنگ کے ساتھ پیدا ہوا ہے تو اس میں اس کا کوئی کمال نہیں ہے اور نہ ہی اسے اس بنیاد پر کوئی امتیاز یا فضیلت حاصل ہو سکتی ہے' اگر کسی کا رنگ گورا یا کالا ہے تو وہ اس کی جائے پیدائش کی وجہ سے ہے کہ وہ کس خطے میں پیدا ہوا ہے۔ اس پر بھی کسی کو کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ کس خطے اور کس گھر میں پیدا ہوا ہے' لیکن ہمارے خون کا رنگ ایک ہی ہے چاہے کوئی گورا ہے یا کالا۔ اس لیے نسل رنگ اور نسل کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق کرنا دراصل خدا تعالیٰ کے اختیار اور تقسیم وانعام کا انکار ہے۔

کینیڈا آنے کے بعد میری سوچ میں اور بھی پختگی آ گئی کہ یہ ایک ملٹی کلچرل کنٹری ہے' ہر رنگ اور نسل کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں اور کینیڈا کا چارٹر آف فریڈم اینڈ رائٹس بھی ہر ایک کو مساوی حقوق کی ضمانت دیتا

ہے۔ میں نے یونیورسٹی ایجوکیشن کے بعد ٹیچر بننے کا فیصلہ کیا اور سرٹیفائیڈ ٹیچر کے طور پر پڑھانے لگ گیا۔

سال بھر میں مجھے اندازہ ہوا کہ میل ٹیچرز کے لیے کینیڈا کے سکول سسٹم میں بہت مشکلات ہیں۔ پڑھائی کے دوران میری ملاقات ماریہ سے ہوئی۔ جس کی فیملی بھی یوکرین سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بھی ٹرینی ٹیچر کے طور پر آئی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو اچھے لگے اور شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ شادی کے بعد جب میں نے محسوس کیا کہ میل ٹیچر کینیڈا کی سکول ریگولیشنز کی وجہ سے کافی مشکل میں ہوتے ہیں۔ اس لیے ٹیچر کی جاب چھوڑ کر میڈیکل سیلز کی جاب شروع کر دی۔ جس میں مَیں کافی بہتر محسوس کرتا ہوں اور آمدنی بھی اتنی ہو جاتی ہے کہ آسانی سے گزر بسر ہو جاتی ہے۔ میری بیوی ماریہ سکول میں ٹیچر ہے۔ ہماری کبھی کبھار سکول میں ہونے والی سرگرمیوں پر بات چیت بھی ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ وہ گریڈ ون سے اب گریڈ فور کے بچوں کو پڑھانے لگی ہے۔ اس نے اپنی کلاس کے بچوں کے والد کے ساتھ ایک دن منانے کا پروگرام بنایا ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے سکول سے منظوری بھی لے لی ہے۔

ماریہ نے مجھے بتایا کہ بچوں کے گھروں میں ایک کنسنٹ فارم بھیجا جائے گا جس میں بچے اپنے والدین سے ان کی دستیابی کے لیے دستخط کروا کر لائیں گے تا کہ اس کے مطابق انتظامات کیے جا سکیں۔ میں نے اس آئیڈیا کو سراہا کہ ایک اچھا اقدام ہے اور اس سے سکول، والدین اور بچوں کے درمیان بہتر ہم آہنگی پیدا ہو گی۔ اگلے دن جب میری بیوی ماریہ سکول سے واپس آئی تو وہ بہت پریشان تھی اور میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایسا کبھی پہلے ہوا نہیں تھا۔ مجھے بہت تشویش ہوئی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے جو اس قدر غمگین اور پریشان ہے۔ اس کی آنکھوں آنسو بھی آئے ہوئے ہیں۔

میں نے پوچھنے کی کوشش کی تو وہ آنسو صاف کرتے ہوئے یہ کہہ کر اپنے کمرے

میں چلی گئی کہ آپ کو بعد میں بتاتی ہوں۔

کچھ دیر بعد جب میں نے اس کو کہا کہ چلیں مل کر سیر کرتے ہیں تو وہ اپنا چہرہ دھو کر سامنے ٹیبل پر بیٹھ گئی اور میں نے اپنا سوال دہرایا:

''ایسا کیا ہوا ہے جو وہ سکول سے اس قدر پریشان اور غمزدہ لوٹی ہے''۔

جواب میں اس نے کہا:

''میں نے بچوں کے والد کے ساتھ' فادر ڈے ٹو گیدر'' منانے کا جو پلان بنایا تھا اس کے سلسلے میں فارم بچوں کے گھر بھیجے گئے تو آج تمام بچوں کو اپنے والد سے دستخط کے ساتھ واپس لانا تھے لیکن میں اس وقت حیرت زدہ رہ گئی اور مجھے بہت افسوس ہوا کہ دس میں سے آٹھ بچوں کے والد دستیاب ہی نہیں یعنی وہ فاسٹر پیرنٹنگ میں رہ رہے تھے۔

اس بات نے میرے دل اور دماغ پر گہرا اثر کیا۔ ایسے تمام بچے اپنے والد کے بارے میں جانتے تک نہیں ہے اور میں اپنے اس پروجیکٹ میں ناکامی پر بہت افسردہ تھی۔ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی۔ سکول سے گھر آنے تک میری حالت غیر ہو چکی تھی۔ آئی ایم سوری اس وقت آپ کے سوال کا جواب نہیں دیا کیونکہ میں بہت جذباتی ہو چکی تھی''۔

یہ کہہ کر ماریہ نے مجھے ایک زبردستی کی سمائل بھی دی۔

دراصل کینیڈا کے بہت سے سکولوں میں ایسے بچے بھی پڑھتے ہیں جو فیملی سروسز ڈیپارٹمنٹ کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔ ان بچوں کے والدین بری عادات جن میں شراب یا نشے کی عادت' نامناسب رویہ اور تشدد کی وجہ سے بچوں کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے اپنی تحویل میں رکھ کر ان کے کھانے پینے' رہائش اور سکول میں تعلیم کا بندوبست سرکار کے اخراجات پر کیا جاتا ہے۔ ایسے بچوں کو ایک عرصے کے بعد اپنے اصل والدین کے نام بھی بھول جاتے ہیں' کچھ یاد نہیں رہتا حتیٰ کہ شکلیں تک بھول جاتی ہیں۔ لاوارث

اور یتیم بچوں کو فاسٹر پرنٹنگ کے لیے ایسے جوڑوں کو سونپ دیا جاتا ہے جو اپنے بچوں کی پرورش عموماً فارغ ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ سرگرمی کے طور پر سرکاری طور پر تحویل میں دیے گئے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح گھر میں رکھیں۔ تعلیم کے لیے سکول بھیجتے رہیں۔

ایک صاحب بیگم اور تین بیٹیوں کے ساتھ جیسے ہی گاڑی میں بیٹھے تو میں نے اچانک سوال کیا کہ آپ ساجد صاحب ہیں اور دوبئی سے آئے ہیں؟ میرے اس سوال سے چونک گئے اور بولے:

''آپ کو ہمارے بارے میں کیسے پتہ؟''

میں نے بتایا کہ آپ کے دوست ہمارے ساتھ رہتے تھے اور انہوں نے آپ کے بارے میں بتایا تھا کہ آپ جلد کینیڈا آنے والے ہیں۔

یہ سن کر وہ ریلیکس ہوئے تو میں نے ان سے کہا:

''آپ جتنی جلدی ہو ڈرائیونگ لائسنس لے لیں تا کہ آپ کو کہیں آنے جانے میں دشواری نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی فیملی پانچ افراد پر مشتمل ہے' اگر آپ ٹیکسی میں بیٹھیں گے تو اس میں صرف چار لوگوں کی گنجائش ہوتی ہے اور اگر کوئی ڈرائیور پانچویں فرد کو بٹھانے سے انکار کرے تو وہ حق پر ہوگا۔ اس پر آپ کو غصہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ کینیڈا میں گاڑی میں جتنی سیٹیں ہیں اسی حساب سے انشورنس بھی ہوتی ہے' اگر آپ چار کی بجائے انہی سیٹوں پر پانچ لوگوں کو بٹھائیں گے تو کسی بھی ناگہانی صورت حال میں آپ کو مشکل کا سامنا کرنا کر سکتا ہے۔ ڈرائیور کو اس بارے میں قصوروار ٹھہرا جائے گا''۔

بات غور سے سن رہے ساجد کو میں نے مزید کہا

''اگر آپ کی اپنی گاڑی ہوگی جسے آپ خود چلا رہے ہوں گے تو سواریاں

پوری ہیں پانچ لوگ کار میں بیٹھ کر کہیں بھی جا سکتے ہیں''۔

اس بات پر انہوں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ اس بارے سوچ بچار کر رہے تھے۔

میں نے اگلا سوال کر دیا:

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو یہ بتا سکیں گے کہ آپ نے کینیڈا آنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ دوبئی میں آپ کی بہت پُرکشش ملازمت تھی''۔

میرے سوال پر ساجد صاحب کا ماتھا ٹھنکا اور کہنے لگے:

''نمبر ون وجہ تو یہ ہے کہ بچوں کی اچھی تعلیم کا یہاں بندوبست ہو جائے گا. دوسرا یہ ہے کہ گلف کے ممالک میں آپ جتنی دیر مرضی رہ لیں وہ آپ کو شہریت نہیں دیتے جبکہ کینیڈا میں یہ کام بھی چند سالوں میں ممکن ہو جائے گا۔ اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے لیکن آئی ٹی میں جلد بدیر اچھی جاب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں''۔

میں نے ساجد صاحب سے ایک اور سوال کیا:

''فرض کریں آپ پاکستان میں ہوتے تو آپ اپنی بچیوں کو کسی ایسے سکول میں داخل کرواتے جہاں جھگی والوں کے بچے یا ایسے گھروں کے بچے پڑھتے ہوں جن کو اپنے ماں باپ کا نام یا شکل بھی یاد نہ ہو''۔

اس غیر متوقع سوال پر نہ صرف ساجد صاحب چکرا گئے بلکہ میں نے نوٹس کیا کہ ان کی بیگم بھی گھبرا گئی تھیں۔

''ہرگز نہیں کروائیں گے، کبھی نہیں''۔

ساجد صاحب نے دوٹوک انداز میں متوقع جواب دیا۔

ساجد صاحب میری طرف دیکھ رہے تھے کہ میں نے کہا:

''آپ یہاں کینیڈا میں اپنے بچوں کو ایسے سکول میں داخل کروانے پر مجبور ہوں گے''۔

''یہ آپ اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

ساجد صاحب نے الٹا مجھ سے سوال کیا کیونکہ ان کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں نے ان کو بتایا کہ دیکھیں آپ نئے آئے ہیں اور آپ کو اس بارے میں بہت جلد علم ہو جائے گا کہ ہر سکول میں متعدد ایسے بچے آتے ہیں جن کو والدین کی بجائے گروپ ہوم میں سے ورکر چھوڑنے کے لیے آتے ہیں۔ ایسے بچوں کو اپنے حقیقی والدین کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا۔

اس صورتحال میں آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ والدین کے بغیر بچوں کی نفسیات اور عادات نارمل نہیں ہوتیں۔ آپ کے بچوں کو بطور طالب علم اور آپ کو بطور والدین بہت محتاط رہنا ہوگا اور بچوں کے ساتھ اس موضوع پر گاہے بگاہے بات کرنا ہوگی' پھر ان کے فیڈ بیک کو بھی آپ مدنظر رکھ کر ان سے مزید گفتگو کرتے رہیں تو آپ کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔ ساجد صاحب خاموش بیٹھے تھے کہ ہم ان کے ایڈریس پر پہنچ گئے تو وہ محض شکریہ کہہ کر رخصت ہو گئے۔